جدید اردو
غزل
۱۹۷۱ء سے ۲۰۱۰ء تک
ڈاکٹر راحت بدر

# جدید اردو غزل

## ۱۹۷۱ء سے ۲۰۱۰ء تک

ڈاکٹر راحت بدر

ایم۔ آر۔ پبلی کیشنز، نئی دہلی

نام کتاب : جدید اردو غزل (۱۹۷۱ سے ۲۰۱۰ء تک)

ناشر و مصنفہ : ڈاکٹر راحت بدر

مطبع : نیو انڈیا آفسیٹ پرنٹرز، نئی دہلی۔

تعداد : 500

زیرِ نگرانی : ایم۔ آر۔ پبلی کیشنز

10 میٹرو پول مارکیٹ، 2724-25 کوچہ چیلان، دریا گنج، نئی دہلی

---

**Jadeed Urdu Ghazal** (1971-2010)

*by*

**Dr. Rahat Badr**

**Taiyab House, 11 Rehana Colony, Idgah Hills, Bhopal (M.P.)**
**Ph.: 0755-2547018, 09425007018**

---

**ISBN: 978-93-80934-23-5**



**Edition :2011**

Price: **Rs. 161/-**

Printed & Distributed by

***M. R. Publications***

***Printers, Publishers, Book Sellers & Distributors of Literary Books***

**# 10 Metropole Market, 2724-25 First Floor**
**Kucha Chelan, Daryaganj, New Delhi-110002**
**Cell: 9810784549, 9873156910**
**E-mail: abdus26@hotmail.com**

جدید غزل کے اہم شاعر

ڈاکٹر بشیر بدرؔ

کے نام

کہاں پر ہے منزل خبر ہی نہیں
غزل ہم سفر ہے تو ڈر ہی نہیں

(راحت بدر)

زندگی کی سب کتابیں پڑھ کر اس نے دیکھ لیں
کون کتنا جانتا ہے وقت ہی بتلائے گا

(راحت بدر)

# فہرست

# پیش لفظ

اردو شاعری سے دلچسپی مجھے اسکول کے زمانے سے ہے۔ اچھی معیاری غزلیں اور اشعار اپنی ڈائری میں لکھنا اور جہاں تک ممکن ہو ان کو ازبر یاد کر لینا میرا ہمیشہ کا شوق رہا ہے اسی لئے میرا پی. ایچ. ڈی کا موضوع بھی جدید اردو غزل تھا۔ اس کو کتاب کی شکل دینے کے لئے کچھ ترمیم اور اضافے بھی کئے ہیں۔ گذشتہ چند دہائیوں میں جدید اردو غزل نے اپنی ایک علیحدہ پہچان بنالی تھی اور ہندوستان و پاکستان کے ادبی حلقوں میں جدید اردو غزل موضوعِ گفتگو بھی تھی لیکن ایسی کوئی کتاب دستیاب نہیں ہو رہی تھی جس میں غزل کے اس عہد (۱۹۷۱ سے ۲۰۱۰ تک) کو تنقیدی نظر سے پرکھا گیا ہو، کیونکہ عالمی سطح پر آج غزل سب سے ہر دلعزیز شعری صنف سخن ہے۔ اس کتاب میں جدید اردو غزل کے ارتقائی سفر کا ان شعراء کے حوالے سے تفصیلی مطالعہ کیا گیا ہے جن کی اس سلسلے میں مستند اہمیت ہے یہ مطالعہ پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ جدید اردو غزل کے ارتقائی سفر کا وضاحت کے ساتھ ان شعراء کے حوالے سے مطالعہ کیا جن کی اس سلسلے میں مستند اہمیت ہے۔

ابتدائی باب میں امیر خسرو سے ۱۹۷۰ء تک اردو غزل کے ارتقائی سفر کو بطور پس منظر قلم بند کیا ہے اور غزل کے مزاج اس کے فن، اس کے موضوعات زبان اور طرز بیان کے ساتھ ساتھ تمام اہم شعراء کی غزل سے متعلق خدمات بھی پیش کی گئی ہیں۔ جن شعراء کا ذکر دوسرے باب میں ہے انہوں نے غزل کے پرانے موضوعات کو نئی زندگی سے ہم آہنگ کر دیا ہے اس لئے ان کے یہاں غزل کی لفظیات میں بڑی تبدیلی آئی ہے، پرانے استعارے کم ہو گئے ہیں اور نئے لفظوں سے نئی امیجری بنائی گئی ہے جو پرانی سے بھی ہم آہنگ ہے۔ باب دوم کے شعراء میں سے اکثر کا کلام ہندی، گجراتی، مراٹھی، پنجابی اور سندھی میں چھپا ہے۔

تیسرے باب میں جدید غزل کا فنی مطالعہ کیا گیا ہے اور ان نئے لفظیات اور نئے نئے موضوعات کو سامنے لایا گیا ہے جو غزل کے نئے پن اور جدّت کا ثبوت ہیں۔ باب چہارم میں یہ بتایا گیا ہے کہ جدید اردو غزل نے ہندی غزل کو کس قدر متاثر کیا ہے اور ہندی کے کویوں کے ساتھ غزل کے گلوکاروں نے اس کو مقبول عام بنانے میں بہت بڑا کردار ادا کیا ہے۔ غزل کے جن گلوکاروں نے غزل کو عام لوگوں میں محبوب صنف سخن بنایا ان میں خاص طور سے جگجیت سنگھ، چندن داس، طلعت عزیز اور آشا بھونسلے وغیرہ ہندوستان میں اور مہندی حسن، غلام علی وغیرہ پاکستان کے قابل ذکر ہیں۔

ہندی کے کوی آج جس غزل کو جدید ہندی غزل کہہ رہے ہیں ان کی غزلوں کے اشعار بھی پیش کئے گئے ہیں تاکہ یہ اندازہ لگایا جا سکے کہ ہندی کے کویوں نے اپنی غزلوں میں فارسی الفاظ بھی استعمال کئے ہیں، حالانکہ ہندی میں غزل کی کوئی قدیم روایت نہیں ہے وہ پوری طرح اردو غزل کے زیر اثر پروان چڑھی ہے۔ زندگی کا یہ فلسفہ بھی ہے کہ ہر آنے والا زمانہ اپنے ماضی کی کل میراث کا وارث ہوتا ہے اور اپنے فکر وفن سے کچھ اضافے بھی کرتا ہے۔ اسی طرح ہندوستان کی اکثر علاقائی زبانیں غزل کی شمع کو روشن کرنے کیلئے ایک ہوتی نظر آرہی ہیں۔ شمالی ہند کی اکثر زبانوں میں غزل کہی جا رہی ہے اور ہندی اردو کے شعراء کی غزلوں کے ترجمے ہو رہے ہیں۔ ہر گزرا ہوا عہد جدید عہد کو پیدا کرتا ہے۔ اس کا رقیب نہیں ہوتا۔ امیر خسرو سے جگر مرادآبادی تک غزل لحہ لحہ زندگی کا نغمہ بنتی گئی۔ قدیم شعراء کی روایتوں کو عصرِ حاضر کے غزل گو شعراء نے آگے بڑھایا ہے اور وراثت میں ملی ہوئی تمام روایتوں کی حفاظت بھی کی ہے۔ آج کی غزل میں ایسے کئی اضافے ہوئے ہیں جو غزل کی فنی روایت اور مزاج کو زندہ رکھتے ہوئے اسے نئے افکار اور رجحانات سے روشناس کرانے میں کامیاب ہیں۔ یہ اضافے اپنی عظیم وقدیم امانت کے پاسدار بھی ہیں اور عہد حاضر کے فکر وفن اور تجربوں کا احترام کرتے ہوئے آج کی غزلیہ منظر نامے میں انفرادیت کے علمبردار بھی ہیں۔

میرے پاس الفاظ نہیں کہ اس سلسلہ میں اللہ پاک کی رحمتوں کی تفصیل لکھ سکوں

جس نے مجھے بہت کچھ دیا۔ میرے والد سید فتح علی صاحب مرحوم جنھوں نے میرے اندر ادبی ذوق پیدا کیا۔ میری والدہ سیدہ بیگم صاحبہ جن کی کاوشوں اور دعاؤں سے میں یہاں تک پہنچی اور سب سے زیادہ مشکور ہوں اپنے شریک حیات ڈاکٹر بشیر بدر کی جن کی ہم سفری نے مجھے بہت کچھ سکھا دیا۔ ۲۰۰۹ء میں جب ہم دونوں حج بیت اللہ سے واپس آئے تو میں نے شاعری شروع کی اور سب سے پہلے نعت پاک لکھی۔ چند اشعار پیش کرتی ہوں۔

یادوں میں جی رہی ہوں اس مختصر سفر کی
نورانی شہر اُنؐ کا ادنیٰ کلام میرا
ان کے قریب جا کر جنت کو پالیا ہے
اے کاش وہؐ یہ کہہ دیں یہ ہے غلام میرا

اس کے بعد کئی غزلیں بھی لکھ چکی ہوں۔ ان میں سے چند منتخب اشعار اس کتاب میں شامل ہیں۔

تہہ دل سے شکر گزار ہوں اپنے اساتذہ کا جنھوں نے صحیح معنوں میں مجھے اردو ادب کا ایک ادنیٰ طالب علم بنا دیا۔ آخر میں چھوٹا سا شکریہ اور بڑی بڑی دعائیں اپنے بیٹے سید طیب بدر کو جو اس کتاب کی تیاری کی وجہ سے اکثر میری بے توجہی کا شکار رہا۔

خاکسار

راحت بدر

شعبہ اردو، آل سینٹس

عیدگاہ ہلس، بھوپال (ایم. پی.)

باب اوّل

# اردو غزل امیر خسرو سے ۱۹۷۰ء تک

غزل اردو شاعری کی سب سے ہر دل عزیز صنف ہے۔ جسے رشید احمد صدیقی نے ''اردو شاعری کی آبرو کہا ہے'' اردو کے شعری سرمائے کا تقریباً ۹۰ فیصد حصہ غزل کی شکل میں ہے۔ غزل کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ یہ دو مصرعوں میں بڑی سے بڑی بات اور بڑی سے بڑی کہانی کہہ دیتی ہے۔ اسی لئے غزل دنیا بھر کی سب سے محبوب صنف سخن ہے۔ جسکی ابتداء فارسی میں ہوئی۔ اردو میں اپنے فارم (Form) کے لحاظ سے غزل نے بحریں ردیف اور قافیہ کے ساتھ طرز بیان اور مضامین میں فارسی کا اتباع کیا جو غزل کی شناخت ہیں۔ غزل کی ساخت کے لحاظ سے مطلع اور پھر مختلف اشعار اور آخر میں مقطع ہونا لازمی تھا۔ لیکن اب بہت سے لوگ مقطع گاہے گاہے کہہ لیتے ہیں اسکے علاوہ کوئی فنی تبدیلی نہ ہوئی اور نہ ہو سکتی ہے۔ غزل نہ صرف اس لحاظ سے کہ اس کے دو مصرعوں میں ایک لمحاتی تجربہ یا صدیوں کی کہانی دونوں آجاتے ہیں بلکہ زندگی کے تمام مسائل کائنات کے رموز و فلسفے کے باریک نکتے بھی بیان ہو جاتے ہیں۔ غزل کا شاعر ہی یہ کہہ سکتا ہے۔

میں ہر لمحہ میں صدیاں دیکھتا ہوں
تمھارے ساتھ اک لمحہ بہت ہے

(بشیر بدر)

غزل کے اس شعر میں اختصار کے ساتھ جولمحاتی حقیقت ہے اس سے بڑھ کر صدیوں کی داستان ہونے کا اشارہ بھی ہے۔ دراصل غزل کو حسن کمال تو فارسی سے ملا، جس طرح ذہین والدین کے بچے ان سے زیادہ ذہین زمانہ شناس، صاحب دل اور خوبصورت ہو سکتے ہیں، اسی طرح اردو غزل دنیا میں فی الوقت بے مثال ہے اس کے حُسن میں فکری گہرائی ہے۔ اسکی معنویت کا مقابلہ دوسرے شعری اصناف نہیں کر پاتے۔ اسی لئے سب سے چہیتی اور خوبصورت شکل میں جو صنف فارسی سے اردو شاعری میں آئی اس کا نام غزل ہے۔ غزل کو عروج فارسی میں بہت پہلے مل چکا تھا لیکن اردو میں جن چند شعراء نے ابتدائی دور میں غزلیں لکھی ہیں ان میں سب سے پہلا نام امیر خسرو کا ہے۔ امیر خسرو غزل کے پہلے شاعر کہے جاتے ہیں ان کی شخصیت جامع صفات تھی۔ ان کو فارسی، اردو، ہندی پر یکساں قدرت تھی۔ ان کے بیشتر اشعار اسی ملی جلی زبان کا بہترین نمونہ ہیں جن میں اردو اپنی ابتدائی شکل میں فارسی کے ساتھ ملی ہوئی نظر آتی ہے۔ مثلاً یہ شعر ہندی اور اردو کا خوبصورت سنگم ہے ؎

گوری سوئے سیج پر مُکھ پر ڈارے کیس
چل خسرو گھر آپنے رین بھئی چوندیس

آج دیکھا جائے تو اُس وقت کے ہندی اور اردو کے کئی لفظوں کا املا تک بدل گیا ہے لیکن ان کے اشعار کی شعریت لازوال ہے کہ آج کے کسی بھی مشہور شعر سے یہ شعر کم مشہور نہیں ہے۔ اسی لیے علامہ اقبالؔ نے ان کے لیے لکھا ہے؎

رہے نہ ایبک و غوری کے معرکے باقی
ہمیشہ تازہ و شیریں ہے نغمۂ خسرو

بظاہر امیر خسرؔو کی غزل میں کھڑی بولی اور فارسی کا امتزاج ہے یہ اس بات کا پتہ دیتا ہے کہ اُس وقت بڑی تیزی سے ہندوستانی زبانیں فارسی سے گھل مل رہی تھیں اور فارسی کا تہذیبی لہجہ بھی مقامی شاعری کی معصومیت سے اور دلنشیں ہو رہا تھا۔ امیر خسرو کا کلام فارسی، ہندی اور اردو کا ایسا امتزاج ہے کہ بلاشبہ اگر اسے خالی فارسی یا صرف ہندی یا صرف اردو میں لکھتے تو کبھی اتنا حسن پیدا نہیں ہوتا۔ شرابِ دو آتشہ تو ہم نے سنی تھی لیکن یہ شراب تو سہ آتشہ ہے:

زحال مسکیں مکن تغافل درائے نیناں، بنائے بتیاں
کہ تاب ہجراں نہ دارم اے جاں نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں
شبان ہجراں دراز چوں زلف و روز و وصلت چو عمر کوتہ
سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں
یکا یک از دل دو چشم جادو بصد خرابیم صبرو تسکیں
کسے پڑی ہے جو جا سناوے پیارے پی کو ہماری بتیاں
چو شمع سوزاں چو ذرہ حیراں ہمیشہ گریاں بعشق آں مہ
نہ نیند نینا، نہ انگ چیناں، نہ آپ آویں نہ بھیجیں پتیاں
بحق روز وصال دلبر کہ داد مارا فریب خسرؔو
سپیت من کی درائے راکھوں جو جانے پاؤں پیا کی گھتیاں

سید غلام سمنانی نے اپنی کتاب ''امیر خسرؔو'' جو نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا۔ نئی دہلی نے شائع کی ہے اور جس کی اشاعت ثانی ۱۹۹۵ء میں ہوئی ہے اس کتاب کے صفحہ دس پر لکھا ہے۔

''ابوالحسن یمین خسرو جو بعد میں امیر خسرو کے نام سے معروف ہوئے، ۱۲۵۳ء (۶۵۱ھ) میں بمقام مومن پور (موجودہ پٹیالی) ضلع ایٹہ (یو پی) پیدا ہوئے۔ دارا شکوہ نے اپنی کتاب ''سفینۃ الاولیاء'' میں اس قصبہ کا نام مومن آباد لکھا ہے''۔

شمالی ہند میں اس عہد میں خسرو کے علاوہ کوئی اہم اردو غزل گو شاعر نظر نہیں آتا بلکہ کافی عرصے بعد دکن میں اردو غزل کو عروج ملا۔ اردو غزل کے پہلے صاحبِ دیوان شاعر دکن کے حکمراں محمد قلی قطب شاہ ہیں۔ جو ۱۵۸۰ء میں گولکنڈے میں پیدا ہوئے ان کے والد کا نام ابراہیم قطب شاہ تھا اور ۱۶۱۱ء میں ان کا انتقال ہوگیا۔ ان کے بارے میں سید محی الدین قادری زورؔ نے اپنی کتاب ''اردو شاعری کا انتخاب'' میں لکھا ہے:۔

''ابراہیم قطب شاہ کے فرزند تھے۔ گولکنڈے میں پیدا ہوئے۔ پہلے صاحبِ دیوان شاعر اور شہر حیدرآباد کے بانی ہیں۔

(صفحہ ۲۲)

محمد قلی قطب شاہ نے دو تخلص اختیار کئے تھے ایک ''معانی'' دوسرا ''قطب''۔ ان کی ابتدائی غزلوں میں گیت کا آہنگ اس لئے ملتا ہے کیوں کہ وہ اردو میں گیت بھی لکھتے تھے لیکن غزلوں میں انہوں نے فارسی غزلوں کی پوری اتباع کرتے ہوئے اس وقت کی اپنے علاقے کی ابھرتی ہوئی ادبی اردو کو پوری طرح غزل میں اختیار کیا:۔

جو کوئی عشق میں ثابت ہے جینا ہے سدا اس کا
سو اس کے نام سے میخانہ سب معمور کر ساقی

☆

پیا تجھ آشنا ہوں میں توٗ بیگانہ نہ کر مجھ کو
ٹلے نہ اک گھڑی تجھ یاد بن لوٹا بسر مجھ کو

اس زمانے میں دکن کے اہم شعراء ملاّ وجہی عہد محمد قلی قطب شاہ کے ملک الشعرا تھے۔ وجہی کے ہم عصر ملا غواصیؔ ملک الشعرائے گولکنڈہ تھے۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ کے نواسے سلطان عبداللہ قطب شاہ کو شاعری کا شوق اور ذوق ورثے میں ملا تھا۔ اسی زمانے کے علی عادل شاہ شاہیؔ سلطان محمد عادل شاہ کے فرزند تھے۔ شعروشاعری سے خاص دلچسپی لی اور شاہیؔ تخلص اختیار کیا۔ شاہیؔ کے شاگرد ملک الشعراء نصرتیؔ تھے۔ اسی قطب شاہی دور کے آخری بڑے شاعر طبعیؔ ہیں جو حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔

ولیؔ تک آتے آتے شاعری کے طویل دور میں اردو زبان کے ہزاروں چھوٹے بڑے شاعر پیدا ہوئے جو اقصائے ہند میں پھیلے ہوئے تھے۔ فارسی غزل کے عروض ، ردیف ، قافیہ اور بحروں کو ابتداء سے ہی اردو غزل نے اپنایا، طرز بیان اور موضوعات پر بھی فارسی کا ہی رنگ غالب رہا۔ قلی قطب شاہ کی وفات سے تقریباً سو سال بعد دکن میں اردو غزل میں زبان اور بیان کے لحاظ سے خاص طور پر تبدیلی شمس ولی اللہ ولیؔ دکنی لائے۔ ان کی اس تبدیلی اور جدّت زبانی کو شمالی ہند کے شعراء نے بھی اپنی شاعری کے لئے اپنایا۔ اس طرح ولیؔ دکنی کی اردو غزل شمالی ہند کے شعراء کے لئے ایک مثال بن گئی۔

ولیؔ کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے اردو غزل کو فارسی غزل کا آئینہ بنا دیا۔ انھوں نے گیتوں کے لہجے کو چند غزلوں میں تو محفوظ رکھا لیکن جلد ہی ان کے یہاں بھی ایسے اشعار آنے لگے جو باقاعدہ غزل کے تھے۔ ولیؔ کی غزلیں رفتہ رفتہ ان کی شناخت

بن گئیں۔ وؔلی کی کلیات میں جو غزلیں ہیں ان میں سے کچھ اشعار پیش ہیں :۔

تجھ لب کی صفت لال بدخشاں سے کہوں گا
جادو ہے تیرے نین غزالاں سے کہوں گا

☆

بے صبر نہ ہو اے وؔلی اس درد سے ہر گاہ
جلدی سے تیرے درد کی درماں سے کہوں گا

وؔلی نے غزل کو محبوب کے حسن اور عاشق کی سچی محبت کا آئینہ بنا دیا ہے اس میں کہیں محبوب کا سراپا ہے کہیں عاشق کی دلی کیفیت کا اظہار مثلاً :۔

دیکھنا ہر صبح تجھ رخسار کا
ہے مطالعہ مطلع انوار کا
یاد کرنا ہر گھڑی تجھ یار کا
ہے وظیفہ مجھ دلِ بیمار کا
آرزوئے چشمۂ کوثر، نہیں
تشنہ لب ہوں شربتِ دیدار کا
مسندِ گل منزلِ شبنم ہوئی
دیکھ رتبہ دیدۂ بیدار کا
اے وؔلی ہونا سری جن پر نثار
مدعا ہے چشمِ گوہر بار کا

یہ غزل نہ صرف یہ کہ اردو کی زندہ جاوید غزل ہے بلکہ اردو شاعری کے ارتقاء

میں اس کی بڑی اہمیت ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ غزل بلاشبہ غزل کے داخلی آہنگ اور اس کی معنویت کا خوب صورت امتزاج ہے ۔ اس کے علاوہ غور طلب بات یہ ہے کہ فارسی کی غزل کی بہت سی خوبیاں اور اس کے اصولوں سے سب سے پہلے وؔلی نے اردو غزل کو سجایا ہے۔ لیکن کہیں کہیں ہندی یا مقامی زبان کے الفاظ آ گئے جیسے مقطع میں ''سری جن پرنثار'' ہونے کا جو ذکر ہے وہ بہت خوبصورت اس لئے ہے کیوں کہ دونوں زبانوں کے الفاظ کے اشتراک سے ایک خوبصورت اور حسین شعر بنا ہے۔ وؔلی نے اس رویہ کو بہت آگے بڑھایا۔ بلاشبہ انہوں نے غزل کا تمام حُسن اور ہندوستان کی اردو شاعری کا تمام مہذب لہجہ ملا کر ایک ایسی اکائی بنائی جسے غزل کی اکائی کہہ سکتے ہیں۔ وؔلی نے غزل کے روایتی موضوعات کے ساتھ اصلاحی مضامین بھی باندھے ہیں مثلاً یہ شعر جس میں اشارہ کیا ہے کہ اپنی کامیابی پر خود نازاں نہیں ہونا چاہئے :۔

آرسی دیکھ کر نہ ہو مغرور
خود نمائی نہ کر خدا سوں ڈر

یا

مفلسی سب بہار کھوتی ہے
مرد کا اعتبار کھوتی ہے

یہ شعر اپنی ستھری زبان کے سبب آج کا لکھا ہوا لگتا ہے۔ حُسن و عشق کے بیان میں وؔلی کا لہجہ بہت خوبصورت اور شگفتہ تھا۔ مثلاً:

اے وؔلی گل بدن کو باغ میں دیکھ
دل صد برگ باغ باغ ہوا

اس پر نظر رکھنا چاہئے کہ اس وقت اردو زبان ابتدائی مراحل میں تھی اس میں الفاظ کا ذخیرہ مختصر تھا۔ ولؔی نے دکنی زبان کے الفاظ لکھ کر یہ کمی پوری کی ہے یہی وجہ ہے کہ کہیں کہیں کو کو ''کوں'' اور سے کو ''سوں'' بھی لکھ گئے ہیں۔ مثلاً:۔

مت جا چمن سوں لالہ بُلبل پہ مت ستم کر
گرمی سوں تجھ نگہہ کی گل گل گلاب ہوگا

☆

دلِ عُشاق کیوں نہ ہو روشن
جب خیالِ صنم چراغ ہوا

☆

سایہ ہو مرا سبز برنگِ پرِ طوطی
گر خواب میں وہ نو خطِ شیریں بچن آوے
کھینچیں پلکیں انکھیاں منِ جوں کحل جواہر
اس شاخ کے گر ہاتھ وہ خاکِ چرن آوے

یہ شعر خاص طور پر اس بات کا اشارہ کرتا ہے کہ ولؔی نے فارسی الفاظ کے ساتھ ہندی اور اردو کے عوامی لہجے کے ایسے الفاظ لیکر ایک بڑی اور خوبصورت زبان بنائی اور اردو زبان میں جو الفاظ کی اس وقت کمی تھی اُس کو بھی پورا کیا۔ ''انکھیاں''، ''بچپن'' اور ''چرن'' اردو زبان میں وسعت اور حُسن پیدا کر رہے ہیں۔

ولؔی کے زمانے میں شمالی ہند میں شاہ مبارک آبرؔو، شیخ شرف الدین مضموؔن، محمد شاکر ناجؔی، محمد احسن احسؔن، غلام مصطفٰے یک رنگؔ وغیرہ فارسی شعر گوئی میں مشغول تھے

مگر اردو میں باقاعدہ شعر کہہ کر ولیؔ نے ان کی توجہ اس طرف کروائی کہ یہ زبان بھی اب باقاعدہ شاعری کے لائق ہوگئی ہے۔

ولیؔ نے تعلیم اور سیاحت کے سلسلے میں احمد آباد، برہانپور، سورت اور دلّی کا سفر کیا۔ ولیؔ کا دیوان ان کے دلّی جانے کے تقریباً پندرہ سال بعد دلّی پہنچا۔ دلّی کے فارسی گوشاعروں نے ولیؔ کا کلام سننے اور ان کا دیوان دیکھنے کے بعد اردو میں شاعری شروع کی۔ اس طرح شمالی ہند میں باقاعدہ اردو غزل گوئی کا آغاز ہوا اور نئے نئے رنگ اور آہنگ سامنے آئے۔ ولیؔ کے زمانے کے اہم شعراء کے کچھ مشہور اور اہم اشعار جس سے اس عہد کی شیریں مزاجی، بلند پروازی، اعلیٰ تخیل کا اندازہ ہوسکے اور یہ بھی معلوم ہو کہ ابتداء میں بھی اردو غزل فارسی غزل سے بہت کچھ سیکھ کر آگے بڑھی اور ہندوستانی تہذیبی مزاج اور شعری آہنگ کی شمولیت سے اپنے لئے نئی راہیں استوار کرتی چلی گئی۔

شاہ مبارک آبرو غزل کے قابلِ ذکر شاعر گذرے ہیں۔ ان کا اصلی نام نجم الدین تھا۔ وہ شاہ محمد غوث کے بیٹے تھے۔ ان کی غزل کے چند شعر درج ذیل ہیں:۔

لب شیریں پہ سریجن کے نہیں خطؔ سیاہ
ڈار چھوٹی ہے میٹھائی پہ شکر خوروں کی

چمکیں سورج میں جوں خط شعاع کے شعلے
دیکھ انکھیوں میں یہ لال جھمک ڈوروں کی

آبروؔ کوں نہیں کم ظرف کی صحبت کا دماغ
کس کو برداشت ہے ہر وقت کے نکتو رونکی

شاہ سید سراج الدین سراجؔ اس عہد کے ایک اور اہم شاعر ہیں۔ اورنگ آباد

میں پیدا ہوئے۔ ان کی بے حد کامیاب غزل کے چند شعر لکھے جا رہے ہیں جنکو شامل کئے بغیر غزل کا ارتقائی سفر ممکن نہیں ہوسکتا۔

خبر تحیرِ عشق سُن، نہ جنوں رہا نہ پری رہی
نہ وہ تو رہا نہ وہ میں رہا، جو رہی سو بے خبری رہی

شہ بے خودی نے عطا کیا مجھے اب لباس برہنگی
نہ خرد کی بخیہ گری رہی، نہ جنوں کی پردہ دری رہی

چلی سمت غیب سے اک ہوا کہ چمن سرور کا جل گیا
مگر ایک شاخِ نہالِ غم جسے دل کہیں سو ہری رہی

نظر تغافلِ یار کا گلہ کس زباں سے بیاں کروں
کہ شراب حسرت و آرزو خُم دل میں تھی سو بھری رہی

وہ عجب گھڑی تھی کہ جس گھڑی لیا درس نسخہ عشق کا
کہ کتاب عقل کی طاق پر جو دھری تھی سو وہ دھری رہی

تیرے جوشِ حیرتِ حُسن کا اثر اس قدر ہے یہاں ہوا
کہ نہ آئینے میں جلا رہی، نہ پری میں جلوہ گری رہی

کیا خاک آتشِ عشق نے دل بے نوائے سراجؔ کو
نہ خطر رہا نہ حذر رہا جو رہی سو بے خبری رہی

(اردو غزل صفحہ ۴۱۱)

مرزا جان جاناں مظہر دہلوی، رائے ٹیک چند بہادر، میر محمد سجاد سجادؔ، راجہ رام نرائن موزوںؔ، میر عبدالحی تاباںؔ، شاہ واقفؔ دہلوی، محمد امان نثارؔ اور میر محمد بیدارؔ دہلوی

وغیرہ بھی اسی عہد کے اہم شاعر ہیں۔ جنکے شعر پیش خدمت ہیں جس سے اندازہ ہوگا کہ غزل کے بعض ہندوستانی الفاظ جو مقامی بولیوں سے آئے اُنہیں جلد ہی چھوڑ دیا گیا اور فارسی کے لفظوں کو غزل میں شامل کرلیا گیا۔

مرزاں جان جاناں مظہر دہلوی کا شعر ہے :۔

زخمی تیری نگہ (نگاہ) کا اک پل جیا تو پھر کیا
صیاد کی بغل میں ٹک دم لیا تو پھر کیا

لیکن مظہر دہلوی کا کمال ہے کہ اسی زبان میں انہوں نے ایسے شعر بھی کہہ دیئے جو آج بھی مشہور ہیں اور تقریباً ہر تذکرے میں شامل ہوتے ہیں کیوں کہ یہ ہمارے تجربوں سے ہم آہنگ ہیں دل کو چھور ہے ہیں اور اظہار کے قریب ہیں ۔

خدا کے واسطے اس کو نہ ٹوکو
یہی اک شہر میں قاتل رہا ہے

خدا کو اب تجھے سونپا ارے دل
یہیں تک تھی ہماری زندگانی

رائے ٹیک چند بہادر اس عہد کے جاوداں شاعروں میں سے ایک ہیں۔ ان کا شعر ملاحظہ ہو:۔

دل ہمارا لے کے کیوں انکار کرتے ہو سجن
کس سے یہ سیکھے ہو تم لے کر مکرنے کی طرح

میر محمد سجاد سجاؔد کا شمار بھی اس عہد کے اہم شاعروں میں ہے جن کے تذکرے کے بغیر غزل کی تاریخ ادھوری رہ جائے گی۔ میر محمد سجاؔد فرماتے ہیں۔

بتوں کی بھی یہ یاد دو روز ہے

ہمیشہ رہے نام اللہ کا

☆

رات اس زُلف کا وہ افسانہ

قصہ کوتاہ بڑی کہانی ہے

☆

عشق کی ناؤ پار کیا ہووے

جو یہ کشتی ترے تو بس ڈوبے

راجہ رام نرائن موزوںؔ قابلِ ذکر شاعر ہیں۔ ان کی شاعری قدیم اور روایتی شعری سرمایہ کا لازوال حصہ ہے۔ میر تقی میرؔ نے اپنی کتاب نکات الشعراء میں موزوں کے اس شعر کی بڑی تعریف کی ہے۔

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی

دوانہ مر گیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزری

میر عبدالحئی تاباںؔ کے اشعار ملاحظہ ہوں ۔

ہم بے کسی پہ اپنے نہ روئیں تو کیا کریں

دل سا رفیق ہائے ہمارا جدا ہوا

☆

اڑا دے صبا خاک میری اگر تو

تو کوچے میں اس بے وفا کے ہی لے جا

☆

غم وصل میں ہے ہجر کا ہجراں میں وصل کا
ہرگز کسی طرح مجھے آرام ہی نہیں

☆

سن فصلِ گل خوشی ہو گلشن میں آئیاں ہیں
کیا بلبلوں نے دیکھو دھو میں مچائیاں ہیں

☆

محفل کے بیچ سن کے میرے سوزِ دل کا حال
بے اختیار شمع کے آنسو ڈھلک پڑے

شاہ واقف دہلوی کہتے ہیں:۔

کبھی ایسا بھی اے خدا ہوگا
وہ صنم ہم سے آشنا ہوگا

محمد امان نثارؔ فرماتے ہیں۔

خاطر سے تیری یاد نہ برباد کریں گے
جس حال میں ہم ہوں گے تری یاد کریں گے

میر محمد بیدار دہلوی کا شعر ہے:۔

ہم خاک بھی ہو گئے پر اب تک
جی سے نہ تیرے غبار نکلا

ان تمام شعراء نے اردو غزل کو بڑا عروج بخشا۔ یہ قافلہ رفتہ رفتہ آگے بڑھتا

رہا اور میر تقی میرؔ کا زمانہ آ گیا۔

**میر تقی میرؔ** غزل کے امام کہے جاتے ہیں۔ ۱۷۲۴ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے اٹھارہ ہزار سے زیادہ شعر ہیں۔ غزل کی دنیا میں میرؔ کو جو مقبولیت اور صلاحیت اللہ نے عطا کی وہ آج بھی زندہ ہے۔ بلاشبہ میرؔ مقبول ترین شاعر ہیں۔ زندگی کی جیسی ترجمانی میرؔ کے یہاں ملتی ہے وہ اب تک کسی اور شاعر کے یہاں نہیں مل سکی۔

میرؔ کی غزل میں اپنے عہد کی ذاتی اور سماجی زندگی سیاسی ناہمواریاں، نوابوں اور بادشاہوں کی خانہ جنگی وغیرہ کا بیان بہت کامیابی کے ساتھ ملتا ہے۔ ان تمام مسئلوں کو بہت خوب صورتی سے غزل بنا دیا ہے۔ میرؔ نے تصوّف کو غزل کے فن کا سرپرست بنایا ہے۔ ان کے بہت سے عشقیہ شعروں میں بھی تصوّف کا رنگ ہے:۔

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

غزل کی اعلیٰ ظرفی یہ ہے کہ دو مصرعوں میں اچھے برے حالات، آپسی جنگ، زندگی کی کامیابی یا ناکامی وغیرہ کو بیان کر دیتی ہے۔ شاعر کا کمال یہ ہے کہ وہ اس طرح کے حالات کو اپنے ذہن میں رکھ کر غزل کی پردہ داری میں اس طرح پیش کرتا ہے کہ پڑھنے والا ذہن اور دل دونوں سے متاثر ہوتا ہے۔ یہ صفت میرؔ کے یہاں درجۂ کمال کو پہنچی ہوئی ہے:۔

دل کی آبادی کی اس حد ہے خرابی کہ نہ پوچھ
جانا جاتا ہے کہ اس راہ سے لشکر نکلا

میرؔ اس شعر میں اپنے محبوب سے شکوہ کرتے ہیں کہ تم نے میرے دل کو تاراج

کر ڈالا اور اگر میرؔ اس کو اس طرح بیان کرتے کہ تم نے میرے دل کو روند ڈالا تو یہ شاعرانہ اظہار نہیں ہوتا۔ اس لئے انہوں نے اپنے دل کی تاراجی کو زمانے کی تاراجی سے جوڑ دیا اور اپنے اس دل کی بربادی میں سیاسی اور سماجی جنگوں کا رنگ اس قدر فنکارانہ انداز سے شامل کر دیا ہے کہ یہ شعر اس دور کی تاریخ کی تصویر بن گیا۔ میرؔ کا یہ شعر بھی بظاہر عشقیہ ہے:۔

دل عجب شہر تھا خیالوں کا

لوٹا مارا ہے حسن والوں کا

لیکن اس کے لاشعور میں اس عہد کے ماحول کا سایہ چھپا ہوا ہے، جہاں لوگ فوج لے کر آتے ہیں لوٹ کھسوٹ کر ظلم ڈھا کر چلے جاتے ہیں۔ میرؔ نے انسانی بستیوں کی بربادی کا نوحہ تو لکھا ہی ہے لیکن بڑی خوبی سے وہ یہ اشارہ کرتے ہیں کہ در و دیوار گرا کر پھر سے بنائے جا سکتے ہیں لیکن ٹوٹے ہوئے دل کی تلافی نہیں ہو سکتی:۔

دل وہ نگر نہیں ہے جو آباد ہو سکے

پچھتاؤ گے سنو ہو یہ بستی اُجاڑ کے

میرؔ کی غزل کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں حسن کی معصوم تصویر کشی، اور اُسی کے ساتھ ساتھ کبھی کبھی محبوب کی بے رُخی، اور عاشق کی سچی دیوانگی، فنکارانہ اور شاعرانہ انداز میں نظر آتی ہے۔

میرؔ کی عظمت کا راز یہ بھی ہے کہ وہ اپنے عشقیہ معاملات میں اور کبھی دوستوں کی بے وفائی کے ذکر کے پردے میں اس عہد کے سیاسی حالات کو بھی غزل میں ڈھال دیتے ہیں۔ میرؔ عام موضوعات کو ایسی سادگی اور داخلیت کے ساتھ بیان کرتے ہیں کہ ہر

کسی کو ان کی آواز اپنے دل کی آواز لگتی ہے۔ میرؔ کی آفاقیت ہی ان کی ہر دل عزیزی کا سبب ہے۔ چند شعر ملاحظہ فرمائیں:۔

دور بیٹھا غبار میرؔ اس سے
عشق بن یہ ادب نہیں آتا

☆

الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماریٔ دل نے آخر کام تمام کیا

☆

شام ہی سے بجھا سا رہتا ہے
دل ہوا ہے چراغ مفلس کا

☆

ہمارے آگے ترا جب کسو نے نام لیا
دلِ ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا
مرے سلیقے سے میری نبھی محبت میں
تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا

☆

یاد اس کی اتنی خوب نہیں میرؔ باز آ
نادان پھر وہ جی سے بھلایا نہ جائے گا

☆

دل سے شوق رخ نکو نہ گیا
جھانکنا تاکنا کبھو نہ گیا

☆

عشق ہمارے خیال پڑا ہے خواب گیا آرام گیا
جی کا جانا ٹھہر گیا ہے صبح گیا یا شام گیا

☆

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا
آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا

☆

ہم فقیروں سے بے وفائی کیا
آن بیٹھے جو تم نے پیار کیا
سخت کافر تھا جس نے پہلے میرؔ
مذہب عشق اختیار کیا

☆

بے خودی لے گئی کہاں ہم کو
دیر سے انتظار ہے اپنا

☆

جو اس شور سے میرؔ روتا رہے گا
تو ہمسایہ کا ہے کو سوتا رہے گا

☆

موئے سہتے سہتے جفاکاریاں
کوئی ہم سے سیکھے وفاداریاں

☆

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

☆

اب کے جنوں میں فاصلہ شاید ہی کچھ رہے
دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

☆

ہستی اپنی حباب کی سی ہے
یہ نمائش سراب کی سی ہے
نازکی اس کے لب کی کیا کہیئے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

☆

گفتگو ریختے میں ہم سے نہ کر
یہ ہماری زبان ہے پیارے

☆

عمر بھر ہم رہے شرابی سے
دل پُر خوں کی اک گلابی سے

☆

پاس ناموس عشق تھا ورنہ
کتنے آنسو پلک تک آئے تھے

☆

فقیرانہ آئے صدا کر چلے
میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے

☆

کھلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے
اس کی آنکھوں کی نیم خوابی سے

☆

مصائب اور تھے پر دل کا جانا
عجب اک سانحہ سا ہو گیا ہے

☆

اب تو جاتے ہیں میکدے سے میرؔ
پھر ملیں گے اگر خدا لایا

میر تقی میرؔ نے کافی لمبی عمر پائی تھی وہ ۸۶ سال کی عمر میں ۱۸۱۰ء میں اس دنیا سے رخصت ہوئے۔

مرزا محمد رفیع سودؔا سن ۱۷۱۳ء میں دلّی میں پیدا ہوئے۔ اپنے اسلوب کے منفرد شاعر ہیں۔ سودؔا کی پہلی شناخت قصیدہ نگاری ہے۔ لیکن بلاشبہ وہ غزل کے بھی بہت اہم شاعر ہیں۔ ان کی غزلیہ شاعری میں زندگی کی شگفتگی زیادہ ہے۔ اپنے زندگی آمیز آہنگ کی وجہ سے سودؔا کی غزل میں بلند خیالی بھی پائی جاتی ہے اور اسی لئے ان کی غزل کا اپنا ایک منفرد مزاج ہے۔ آج بھی غزل کی تاریخ سودؔا کے مطالعے کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔ سودؔا کی رجائی آہنگ ان کی پہچان ہے۔ سودا اپنے استادانہ فکر وفن سے اور زندگی سے نبرد آزمائی کرتے ہوئے بے شک غزل کے اس دور کے اہم شاعروں میں سے ایک ہیں۔ سودؔا کی وفات ۱۷۸۱ء میں ہوئی۔ ان کے چند شعر ملاحظہ فرمائیں:۔

چمن میں صبح جو اس جنگجو کا نام لیا
صبائے تیغ کا موجِ رواں سے کام لیا

☆

گلا لکھوں میں اگر تیری بے وفائی کا
لہو میں غرق سفینہ ہو آشنائی کا

☆

ہم تو قفس میں آن کے خاموش ہو رہے
اے ہم صفیر فائدہ ناحق کے شور کا

☆

برسات کا تو موسم کب کا نکل گیا پر
مژگاں کی یہ گھٹائیں اب تک برستیاں ہیں

☆

جس روز کسی اور پہ بیداد کروگے
یہ یاد رہے ہم کو بہت یاد کروگے

☆

الفت میں کچھ اپنی بھی اثر چاہئے سوداؔ
ہر چند وفا شیوۂ محبوب نہیں ہے

☆

کیفیت چشم اس کی مجھے یاد ہے سوداؔ
ساغر کو میرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

خواجہ میر دردؔ صوفی شاعر تھے ۱۷۱۹ء میں پیدا ہوئے۔ دردؔ کی غزل تصوف کی پاکیزگی اور درد مندی کی وجہ سے اپنا منفرد مزاج رکھتی ہے۔ درد کی غزل تصوف کی پاکیزگی اور دردمندی کی وجہ سے اپنا منفرد مزاج رکھتی ہے۔ یوں تو ہر بڑے شاعر کے یہاں تصوف ہے لیکن خواجہ میر دردؔ نے اسے غزل میں شدّت کے ساتھ برتا ہے۔ سادہ زبان میں تصوف کے حقائق بیان کرنا اور اسے دو مصرعوں میں ادا کر دینا اسی کے ساتھ گہرائی، بلندی اور اثر انگیزی قائم رکھنا خواجہ میر درد کی غزل کا کمال تھا۔ چند اشعار تحریر کئے جا رہے ہیں:۔

جگ میں آکر ادھر اُدھر دیکھا
تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا

☆

ہم نے چاہا بھی پر اس کوچے سے آیا نہ گیا
واں سے جوں نقش قدم دل تو اٹھایا نہ گیا

☆

ہم نے کس رات نالہ سر نہ کیا
پر اسے آہ کچھ اثر نہ کیا

☆

اپنے ملنے سے منع مت کرنا
اس میں بے اختیار ہیں ہم بھی

☆

نے گل کو ہے ثبات نہ ہم کو ہے اعتبار
کس بات پر چمن، ہوس رنگ و بو کریں

☆

تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

☆

دردؔ اس کی بھی دید کر لیجیے
نوجوانی یہ مفت جاتی ہے

☆

بسا ہے کون تیرے دل میں گل بدن اے دردؔ
کہ بو گلاب کی آئی تیرے پسینے سے

☆

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

☆

کون سی رات آن ملئے گا
دن بہت انتظار میں گزرے

☆

ان کی وفات ۱۷۸۵ء میں ہوئی۔ انہوں نے زندگی کے حقائق اور دنیا کی ناپائیداری کے ساتھ اپنے عہد کی آواز اور اپنے دلی جذبات کی خوب صورت ترجمانی کی ہے۔

**سید محمد میر سوزؔ** بھی خواجہ میر دردؔ کے ہم عصر ہیں۔ ۱۷۲۰ء میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے مختصر بحروں میں اپنے فن کا مظاہرہ کیا ہے لیکن ان کے یہاں بلندی اور گہرائی نہیں ہے۔ سوزؔ کے کئی عشقیہ شعروں میں شائستگی نہیں رہ جاتی: مثلاً ؎

مجھ کو دھوکا دیا کہا کہ شراب
ان آنکھوں کا ہوگا خانہ خراب

☆

پھر بھی کہتا ہوں تجھے آسوز کو یوں مت ستا
مت ستا ظالم کہیں تو بھی ستایا جائے گا

میر سوز کی وفات ۱۷۹۸ء میں لکھنؤ میں ہوئی۔

شیخ قیام الدین قائم ، انعام اللہ خاں یقین، خواجہ احسن اللہ بیان، شیخ راسخ عظیم آبادی، احمد علی جوہر، سید محمد اثر اور حسن دہلوی بھی کئی اعتبار سے اہمیت کے حامل ہیں لیکن شیخ غلام ہمدانی مصحفی کو استاد کا مرتبہ حاصل ہے۔ شیخ غلام ہمدانی مصحفی امروہے میں ۱۷۵۰ء میں پیدا ہوئے۔ مصحفی کے یہاں خیال اور فکر کی سچائی ہے، اظہار کی سادگی اور گہرائی ہے۔ یہ خوبیاں انہیں بلاشبہ ایک زندہ جاوید شاعر بناتی ہیں۔ دلی کی تباہی کے بعد فیض آباد اور پھر لکھنؤ چلے گئے اور ۱۸۲۴ء کو وفات پائی۔

مصحفی کے چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

جو اُٹھ گیا فلک کے ستانے سے اُٹھ گیا
آسودگی کا خوف زمانے سے اُٹھ گیا

☆

خواب تھا یا خیال تھا کیا تھا
ہجر تھا یا وصال تھا کیا تھا
چمکی بجلی سی پر نہ سمجھے ہم
حسن تھا یا جمال تھا کیا تھا

☆

ترے کوچے ہر بہانے مجھے دن سے رات کرنا
کبھی اس سے بات کرنا کبھی اس سے بات کرنا

اس وقت کے کچھ اور اہم شاعروں میں شیخ قلندر بخش جرأت (وفات ۱۸۱۰ء) اور میر انشا اللہ خاں انشاؔ (پیدائش ۱۷۵۶ء اور وفات ۱۸۱۶ء) بھی قابل ذکر ہیں۔ خاص طور پر میر انشا اللہ خاں انشاؔ کی غزل کا یہ شعر آج بھی سدا بہار ہے۔

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

اس مطلع کے ساتھ ساتھ غزل کا یہ شعر بھی جاوداں ہے۔

نہ چھیڑ اے نکہت باد بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹھکیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

اسی زمانے کے آغا جان عیشؔ کا یہ شعر بھی بہت مقبول ہوا۔

اے شمع صبح ہوتی ہے روتی ہے کس لئے
تھوڑی سی رہ گئی ہے اسے بھی گزار دے

اس عہد کے بعد غزل کا وہ اہم ترین زمانہ آتا ہے جسے ہم غالبؔ، مومنؔ اور ذوقؔ کا زمانہ کہتے ہیں۔ اس کا سلسلہ آج کی غزل سے واضح طور پر ملتا ہے، کیوں کہ آج تک ان اساتذہ کا اثر جاری اور ساری ہے۔

شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ کی پیدائش ۱۷۸۹ء کو ہوئی اور وفات ۱۸۵۴ء کو ہوئی۔ ذوقؔ غزل اور قصیدہ دونوں میں بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ ذوق کی غزل اس عہد کی زبان کی نمائندگی کرتی ہے اور ان کے یہ چند شعر جو اس عہد میں مقبول تھے آج بھی

خواص اور عوام میں یکساں طور پر پسند کئے جاتے ہیں۔

لائی حیات آئے، قضاء لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

☆

کیا غرض لاکھ خدائی میں ہوں دولت والے
ان کا بندہ ہوں جو بندے ہیں محبت والے

☆

مذکور تیری بزم میں کس کا نہیں آتا
پر ذکر ہمارا نہیں آتا نہیں آتا

☆

اے ذوقؔ دیکھ تو دخترِ رز کو نہ منہ لگا
چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی

☆

ناز ہے گل کو نزاکت پہ چمن میں اے ذوقؔ
اس نے دیکھے ہی نہیں ناز و نزاکت والے

☆

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

☆

بیان دردِ محبت جو ہو تو کیوں کر ہو

زباں نہ دل کے لیے ہے نہ دل زباں کے لیے

اس طرح کے لازوال شعروں کی تعداد ذوقؔ کے یہاں زیادہ نہیں ہے لیکن اس زمانے میں ان کے بہت سے شعر ایسے مشہور تھے جو آج بھی ضرب المثل بن کر زندہ ہیں۔

**مومن خاں مومنؔ** کی پیدائش ۱۸۰۰ء، اور وفات ۱۸۵۱ء میں ہوئی۔

یوں تو مومنؔ، غالبؔ اور ذوقؔ کا ایک ہی زمانہ ہے لیکن سب کے اپنے اپنے خوبصورت رنگ ہیں۔ مومنؔ کی غزل تغزل سے بھرپور ہوتی ہے انھوں نے عشق کی تمام کیفیات کو غزل میں بڑی خوبی سے بیان کیا ہے۔ ان کے کلام میں ایک تاثیر ہے جو دل ودماغ کو بیک وقت چھو لیتی ہے۔

اس غیرت ناہید کی ہر تان ہے دیپک

شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو

ڈاکٹر عبادت بریلوی لکھتے ہیں کہ:۔

”اردو شاعری میں مومنؔ ایک ممتاز حیثیت رکھتے ہیں ان کے تغزل کی رنگین کاریوں میں جدّت کی جو آب وتاب اور اُپج کی جو چمک دمک ہے اس کی مثال اردو غزل کی دو ڈھائی سو سال کی روایت کسی دوسری جگہ مشکل ہی سے مل سکتی ہے۔“

(کلیات مومن مرتبہ ڈاکٹر عبارت بریلوی صفحہ۔۵)

تغزل کے خاص موضوعات کو مومنؔ نے نئے نئے رنگوں میں پیش کیا ہے۔

چند شعر ملاحظہ کیجئے:۔

ٹھانی تھی ہم نے اب نہ ملیں گے کسی سے ہم
پر کیا کریں کہ ہو گئے ناچار جی سے ہم

☆

تو کہاں جائے گی کچھ اپنا ٹھکانا کر لے
ہم تو کل خواب عدم میں شبِ ہجراں ہوں گے

☆

پامال اک نظر میں قرار و ثبات ہے
اس کا نہ دیکھنا نگہِ التفات ہے

☆

میں بھی کچھ خوش نہیں وفا کر کے
تم نے اچھا کیا نباہ نہ کی

☆

میرے تغیر رنگ کو مت دیکھ
تجھ کو اپنی نظر نہ ہو جائے

☆

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی
تلافی کی بھی تو ظالم نے کیا کی

کہا اس بت سے مرتا ہوں تو مومنؔ
کہا میں کیا کروں، مرضی خدا کی

مومنؔ کے بعض شعر دل کو چھو جانے والے ہیں جن کو پڑھ کر بے ساختہ تعریف کے کلمات نکلتے ہیں۔ جیسے یہ شعر ۔

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

اس پر غالبؔ نے مومنؔ خاں کو برسر مشاعرہ داد دی تھی کہ مومنؔ خاں اپنا یہ شعر مجھے دے دو اور میرا سارا دیوان تم لے لو۔ مومن خاں مومنؔ نے شروع ہی سے مرّوجہ جام و پیمانہ کی روایت سے انحراف کرتے ہوئے اپنے عہد کی زبان میں تغزل کے خاص موضوعات پر ایسے ایسے نادر شعر نکالے جو اُنہیں بلاشبہ ایک بڑا شاعر کہلانے کا جواز ہے:۔

ذکر شباب و حور کلام خدا میں دیکھ
مومنؔ میں کیا کہوں، مجھے کیا یاد آ گیا

☆

مانگا کریں گے ہم بھی دعا ہجر یار کی
آخر کو دشمنی ہے دعا کو اثر کے ساتھ

☆

تاب نظارہ نہیں آئینہ کیا دیکھنے دوں
اور بن جائیں گے تصویر جو حیراں ہوں گے

اسد اللہ خاں غالبؔ کی پیدائش ۱۷۹۷ء میں اور وفات ۱۸۶۹ء میں ہوئی۔ غالبؔ، مومنؔ اور ذوقؔ کے ہم عصر تھے لیکن غالبؔ کی شاعری زندگی کی ترجمان ہے۔ غالبؔ کی غزل کو سمجھنے کے لئے زبان دانی ہی نہیں دماغ سوزی کی بھی ضرورت ہے۔ انھوں نے غزل کو اپنی ذہانت سے فلسفیانہ افکار سے روشناس کرایا۔ غالبؔ کی شہرت ایک صرف اردو کے شاعر کی نہیں بلکہ ان کے افکار ایک عالمگیر سطح پر دعوت فکر دیتے ہیں۔ شاعر کی حیثیت سے اُنھیں جتنا زیادہ پڑھا اور سمجھا گیا ان کی شہرت رفتہ رفتہ بڑھتی گئی۔ اردو کے علاوہ دوسری زبانوں میں بھی غالبؔ کے کلام کے ترجمے ہوئے اور ان کی شہرت بڑھتی چلی گئی۔

غالبؔ نے غزل کو زندگی کی ترجمانی کا ہنر دیا ہے جس میں انسان اور انسانیت کے ہر پہلو کو اجاگر کیا ہے۔ دماغ اور دل کی دوئی کو ایک کر دیا۔ اور وہی آج کی شاعری کی شناخت ہے۔ اسی لئے غالبؔ کو آج کے دور کا رہبر قرار دیا جاتا ہے کیوں کہ زندگی اور شاعری میں جو عقلیت ہے اس کا واضح اظہار غالبؔ کے یہاں سب سے زیادہ ہے اور موجودہ زمانے کی غزل پر سب سے زیادہ غالبؔ کا اثر ہے۔

پروفیسر آل احمد سرور نے غالب کی شاعری کے متعلق بہت وضاحت سے کہا ہے کہ:

> ''غالب کی شاعری نہ رعایت لفظی کی شاعری تھی، نہ محاورے کی، نہ عمومی جذبات کے عمومی بیان کی۔ غالبؔ کی شاعری ان کی انفرادیت کی پکار تھی یہ انفرادیت جو تخیل کے آزادانہ پرواز اور تجربہ میں فکر کی آئینہ دار تھی۔ ہر شاعری شروع میں سادہ ہوتی

ہے اور اپنے زمانے میں حقیقی بھی لیکن زندگی کا قانون یہ ہے کہ وہ سادگی سے پیچیدگی کی طرف سفر ہے۔ سادہ شاعری کے معنی یہ ہیں کہ وہ جذبہ کی یک رنگی اور اس کی اکہری کیفیت کی آئینہ دار ہو۔ جیسے جیسے زمانہ آگے بڑھتا جاتا ہے زندگی کے ساتھ شاعری بھی پیچیدہ ہو جاتی ہے۔ ابتدائی شاعری سنائی جاتی ہے اور ترقی یافتہ شاعری پڑھی بھی جاتی ہے۔" (علی گڑھ میگزین، غالب نمبر ۱۹۶۹) (غالب اور جدید ذہن۔ صفحہ ۴)

انگریزی زبان کے اثر کے ساتھ ساتھ جدید علوم سائنس اور فلسفہ کے اثرات سے جیسے جیسے دنیا آگے بڑھتی گئی بیسویں صدی میں غالبؔ کی شہرت بڑھتی چلی گئی۔ اور ہمارے عہد تک آتے آتے غالب غزل کی نئی فکر کی سب سے بڑی علامت بن گئے۔ زندگی کے ہر تجربے کو غالب کی غزل میں دیکھا اور محسوس کیا جا سکتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:۔

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے بہلانے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے

☆

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

☆

تاب لائے ہی بنے گی غالبؔ

واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

☆

غم ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج

شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

☆

دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے

آخر اس درد کی دوا کیا ہے

☆

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں

موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

☆

تیری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہر میں

تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے

اس شعر میں نیا ذہن ہے جو یہ کہتا ہے کہ محبوب کے غم کے علاوہ بھی زندگی میں اور مسائل ہیں۔ اسی طرح وہ عاشق کو بتاتے ہیں کہ خالی عاشق ہو کر دیوانہ بن جانے سے کام نہیں چلتا آدمی کو کامیاب آدمی بھی ہونا چاہیے۔

چاہتے ہیں خوب روؤں کو اسدؔ

آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے

غافل ان مہ طلعتوں کے واسطے

چاہنے والا بھی اچھا چاہیے

غالبؔ نے ابتداء میں اسدؔ تخلص کیا تھا۔ بعد میں غالبؔ تخلص اختیار کیا۔ آج اردو دنیا میں زندگی کے ساتھ ان کے شعر بھی رواں دواں ہیں۔ اسی لئے اردو غزل میں ان کا ایک اہم اور بلند مقام ہے۔ غالبؔ کے لئے یہ کہنا بالکل صحیح ہوگا کہ وہ ایک عہد کے نہیں بلکہ ہر عہد کے شاعر ہیں۔ دنیا بھر میں ان کے اشعار مقبول ہیں۔ ہندی، انگریزی کے ساتھ ساتھ جب دوسری زبانوں میں بھی غالبؔ کی شاعری کے ترجمے ہوئے تو ان کے افکار کی گہرائی اور ان کے فلسفۂ حیات و کائنات کا مطالعہ کیا گیا، ان کی شاعری میں جو عالمی مزاج ہے اسے سراہا گیا۔ عوام و خواص میں ان کی مقبولیت بڑھی۔ غالبؔ نے زندگی کا فلسفہ کیا خوب صورت انداز میں پیش کیا ہے۔ درج ذیل اشعار ملاحظہ فرمائیے :۔

رو میں ہے رخش عمر کہاں دیکھئے تھمے

نے باگ ہاتھ میں ہے نہ پا ہے رکاب میں

☆

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی

بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

☆

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو

بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

☆

سب کہاں کچھ لالہ وگل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

☆

سبزہ گل کہاں سے آئے ہیں
ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے؟

☆

دیر نہیں حرم نہیں در نہیں آستاں نہیں
بیٹھے ہیں رہ گزر پہ ہم کوئی ہمیں اٹھائے کیوں

تصوف، فلسفہ، فکر کی بلند پروازی، تخیل کی رنگ آمیزی کے ساتھ موضوعات اور طرزِ بیان کی ندرت سے بھی غالبؔ نے بلند مقام اور علیحدہ پہچان حاصل کی ہے۔ خود ہی فرماتے ہیں:۔

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالبؔ کا ہے اندازِ بیاں اور

☆

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھکو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

☆

قطع کیجئے نہ تعلق ہم سے
کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

☆

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو
جو مے و نغمہ کو اندوہ روا کہتے ہیں

☆

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر ایک راہ رو کے ساتھ
پہنچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

☆

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

ان اشعار میں کوئی عاشقانہ لہجہ نہیں ہے، حسن و عشق کی داستان نہیں ہے اس میں سیدھے سیدھے اللہ پاک سے ایک بڑا سائنٹفک سوال کیا جارہا ہے کہ آپ کی ایک تخلیق کی ہوئی دنیا تو یہ ہے جس میں ہم رہتے ہیں، بتایئے کہ جو دنیائیں آپ نے اور تخلیق کی ہیں وہ کہاں ہیں؟ یہ وہی جستجو ہے کہ آج سائنٹسٹ دوسری دنیا کی تلاش میں چاند پر جارہا ہے اور کبھی دوسرے سیاروں میں زندگی تلاش کررہا ہے۔

غالبؔ کے بعد جو شعراء حضرات آئے وہ مومنؔ، ذوقؔ اور غالبؔ کے اثر کو قبول کرتے گئے اور اس میں اپنی پہچان بنانے کی بھی کوشش جاری رکھی۔

بہادر شاہ ظفرؔ کی پیدائش ۱۷۷۵ء میں ہوئی اور ۱۸۶۲ء میں رنگون میں جلا وطن کردیئے جانے کے دوران انتقال ہوا۔ بہادر شاہ شروع میں ذوقؔ کے شاگرد تھے اور آخر وقت میں غالبؔ سے بھی مشورہ کرنے لگے تھے۔ غزل میں ماہرِ فن شاعر تھے۔ ان کی

غزلیں ان کے عہد کے حالات اور زندگی کے واقعات کی نمائندگی کرتی ہیں۔ان کے کلام میں حقیقت اور جذبے کی شدّت کا اثر بے حد ہے۔ بہادر شاہ کی یہ غزل اگر انتخاب میں شامل نہ کی جائے تو وہ اردو غزل کا انتخاب ادھورا مانا جائے گا کیوں کہ بہادر شاہ کے ذکر کے بغیر اردو غزل کی تاریخ نامکمل مانی جاتی ہے:۔

نہ کسی کے آنکھ کا نور ہوں نہ کسی کے دل کا قرار ہوں
جو کسی کے کام نہ آسکے میں وہ ایک مُشت غبار ہوں
میرا رنگ روپ بگڑ گیا میرا یار مجھ سے بچھڑ گیا
جو چمن خزاں سے اجڑ گیا میں اسی کی فصل بہار ہوں
نہ تو میں کسی کا حبیب ہوں نہ تو میں کسی کا رقیب ہوں
جو بگڑ گیا وہ نصیب ہوں جو اجڑ گیا وہ دیار ہوں

ان کی درج ذیل غزلیں بہت مشہور ہیں جن کے مطلعے لکھے جارہے ہیں:۔

یا مجھے افسر شاہانہ بنایا ہوتا
یا میرا تاج گدایا نا بنایا ہوتا

☆

بات کرنی مجھے مشکل کبھی ایسی تو نہ تھی
جیسی اب ہے تیری محفل کبھی ایسی تو نہ تھی

☆

کبھی بن سنور کے جو آگئے، تو بہار حسن دکھا گئے
مرے دل کو داغ لگا گئے یہ نیا شگوفہ کھلا گئے

بہادر شاہ ظفر کے یہاں ایسے بے شمار شعر ہیں جو سیدھے دل میں اتر جاتے ہیں کیوں کہ وہ درد و غم سے بھر پور ہیں اور سادگی سے پر نور ہیں۔ جیسے یہ شعر :-

میرے دل میں تھا کہ کہوں گا میں جو یہ دل پہ رنج و ملال ہے
وہ جب آگیا میرے سامنے تو نہ رنج تھا نہ ملال تھا

۱۸۵۷ء کے آس پاس دہلی اور لکھنؤ میں بہت بڑا فرق ہو گیا اگر چہ دونوں جگہ زبان ایک تھی لیکن پھر بھی دونوں میں واضح فرق نظر آنے لگتا ہے۔ اس عہد میں دونوں جگہ غزل کے بڑے شاعر پیدا ہوئے۔ یہ سلسلہ میرؔ سے بہادر شاہ ظفرؔ تک دیکھا جاسکتا ہے۔ اچھی غزل وہ غزل ہے جو دل کے جذبات کی سچی عکاسی کرتی ہے جو اپنی اثر انگیزی اور سادگی کے سبب زیادہ سے زیادہ لوگوں کو متاثر کرتی ہے۔ لسانی علمیت کا اظہار غزل نہیں ہے بلکہ غزل جذبوں کا اظہار ہے۔ جہاں زبان اظہار کی مدد کرتی ہے وہاں دلّی کی غزل میں دل کو چھونے کی اور دلوں کو جیتنے کی جو صلاحیت ہے وہ بہت کچھ کھونے کے بعد ملی تھی۔

دلی سیاسی اور سماجی طور پر محکوم ہو رہی تھی۔ مظلوم کی خاموشی میں بھی ہزار آہیں چھپی ہوتی ہیں جو دل سے دل کا سفر طے کرتی ہیں۔ اسی لیے دلی کی غزل اپنی داخلیت کے سبب جاوداں ہو گئی۔ لکھنؤ کی غزل میں بلاشبہ آتشؔ اور ناسخؔ غزل کے بڑے شاعر اور بڑے استاد مانے جاتے ہیں۔ ناسخؔ کی غزل عربی اور فارسی سے سجی سجائی ہے اردو میں شان و شوکت اور علمیت کا مظاہرہ کرتی ہے۔ مگر غزل دل کی آواز کے بجائے سپاٹ بے کیف اور بے اثر ہو جاتی ہے۔ بلاشبہ ناسخؔ کے لہجے میں استادانہ کرّ و فر ہے۔ یہ مطلع ملاحظہ کیجئے :-

میرا سینہ ہے مشرق آفتاب داغِ ہجراں کا
طلوعِ صبح محشر چاک ہے میرے گریباں کا

خواجہ حیدر علی آتش کے یہاں لکھنوی انداز کی رعایتِ لفظی، زبان سازی اور خارجیت بھی ملتی ہے۔ مگر دہلوی داخلیت کا اثر اکثر کلام پر حاوی ہے۔ شعر دیکھئے:۔

سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا
کہتی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا

☆

حسن پری اک جلوہ مستانہ ہے اس کا
ہشیار وہی ہے کہ جو دیوانہ ہے اس کا

☆

بادشاہی سے فقیری کا ہے پایا بالا
بوریا چھوڑ کے کیا تخت سلیماں مانگوں

وقت سو منصفوں کا منصف ہوتا ہے۔ آج اس وقت کی عالمانہ اور شہری زبان بالکل بھولی ہوئی داستان ہوگئی اور بولی جانے والی عوام کی زبان دلوں کو چھونے کا ہنر جانتی ہے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد دنیا ہی بدل گئی۔ انگیریزوں کا نظام آگیا اور زبان لکھنؤ اور دلّی کا دائرہ توڑ کر لاہور سے کلکتہ تک اور دلّی سے حیدرآباد تک بڑی تیزی سے ایک مخصوص تہذیبی دائرے سے نکل کر شہری، کاروباری اور پورے ہندوستان کی ہندی سے ملتی جلتی بہت بڑی زبان بنتی گئی۔ اس زبان کو غزل کے شاعروں نے بہت خوش اسلوبی سے اپنایا اور اس سلسلے میں سب سے اہم نام نواب مرزا خاں داغؔ دہلوی کا ہے۔

**نواب مرزا خاں داغ دہلوی** :۔ ۱۸۳۱ء کو دہلی میں پیدا ہوئے اور لال قلعہ میں پرورش پائی ۔ جب داغ چار سال کے تھے تو والد نہیں رہے۔ اس کے بعد ان کی والدہ نے بہادر شاہ ظفر کے بیٹے مرزا فخرو سے شادی کرلی۔ اس طرح داغ شاہی خاندان سے جڑ گئے۔

داغ اپنے عہد کے سب سے زیادہ شہرت یافتہ شاعر ہیں۔ نوابوں اور امراء کی محفلوں میں داغ کی غزلوں کو بڑی مقبولیت حاصل رہی۔ داغ کے شعروں میں بعض جگہ پُرخلوص گفتگو کی روانی ہوتی ہے :۔

میری آہ کا تم اثر دیکھ لینا
وہ آئیں گے تھامے جگر دیکھ لینا

☆

خاطر سے یا لحاظ سے میں مان تو گیا
جھوٹی قسم سے آپ کا ایمان تو گیا
دل لے کے مفت کہتے ہیں کچھ کام کا نہیں
الٹی شکایتیں ہوئیں، احسان تو گیا

داغ نے ایسے موضوعات کو غزل میں پیش کیا ہے جو حُسن اور عشق سے بھرپور ہوں اور جو بات وہ شعر میں کہنا چاہتے ہیں وہ سب کے دل کی آواز معلوم ہوتی ہے :۔

خدا رکھے محبت نے کئے آباد گھر دونوں
میں ان کے دل میں رہتا ہوں وہ میرے دل میں رہتے ہیں

داغ کی شوخی اور عاشق مزاجی ان کے اشعار میں خوب نظر آتی ہے:۔

کوئی نام و نشاں پوچھے تو اے قاصد بتا دینا
تخلص داغ ہے اور عاشقوں کے دل میں رہتے ہیں

لہجہ کی سادگی اس شعر میں ملاحظہ ہو:۔

پیامی کامیاب آئے نہ آئے
خدا جانے جواب آئے نہ آئے

داغ کی شاعری میں ایسے اشعار بھی ہیں جو پوری انسانیت کی ترجمانی کرتی ہے:۔

آخر کو عشق کفر سے ایمان ہو گیا
میں بت پرستیوں سے مسلمان ہو گیا

☆

جلا کے داغ محبت نے دل کو خاک کیا
بہار آئی میرے باغ میں خزاں کی طرح

☆

ان سے کہہ دی ہے آرزو دل کی
اب میری بات کا جواب کہاں

داغ کے کچھ اشعار کوٹھے اور بازار کی زینت بن گئے تھے لیکن کچھ سچے اور خالص محبت کے شعر بھی مل جاتے ہیں:۔ مثلاً

رہ روِ راہِ محبت کا خدا حافظ ہے
اس میں دو چار بہت سخت مقام آتے ہیں

☆

دل لگی دل لگی نہیں ناصح
تیرے دل کو ابھی لگی ہی نہیں

☆

کچھ تازگی ہو لذّت آزار کے لئے
ہر دم مجھے تلاش نئے آسماں کی ہے

☆

طبیعت کوئی دن میں بھر جائے گی
چڑھی ہے یہ ندّی اُتر جائے گی

☆

دیا دل تو اے داغؔ اندیشہ کیا
گزرنی جو ہوگی گزر جائے گی

☆

ایک چلّو میں بہت داغؔ بہک اٹھے تھے
آج سنتے ہیں نکالے گئے میخانے سے

☆

اُسے افسانۂ غم ڈرتے ڈرتے
سنایا کچھ کہیں سے کچھ کہیں سے

☆

یہ کیا کہا کہ میری بلا بھی نہ آئے گی
کیا تم نہ آؤ گے تو قضاء بھی نہ آئے گی

☆

کیا جدائی کا اثر ہے کہ شب تنہائی
میری تصویر سے ملتی نہیں صورت میری

☆

اب وہ یہ کہہ رہے ہیں میری مان جایئے
اللہ تیری شان کے قربان جایئے

☆

نہ جانا کہ دنیا سے جاتا ہے کوئی
بہت دیر کی مہرباں آتے آتے

زندگی کے آخری سال داغؔ نے عزت اور وقار کے ساتھ حیدرآباد میں گذارے اور وہیں ۱۹۰۵ء میں وفات پائی۔ زبان کی لطافت اور خیالات کی رنگینی میں نواب مرزا خاں داغؔ دہلوی بے نظیر تھے۔

**منشی امیر احمد امیرؔ مینائی لکھنوی:** ۱۸۲۸ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ امیر مینائی بھی اپنے عہد کے بے حد مقبول غزل گو شاعر ہیں۔ انہوں نے غزل کی سادہ زبان میں بہت ہی بامقصد شعر کہے ۱۹۰۰ء میں حیدرآباد آگئے اور اُسی سال وہیں وفات پائی۔ چند شعر ملاحظہ ہوں :۔

مرغان باغ تم کو مبارک ہو سیر گل
کانٹا تھا ایک میں سو چمن سے نکل گیا

☆

اس دل پہ ہزار جاں صدقے
جس دل میں ہے آرزو تمہاری

☆

اس روش سے وہ چلے گلشن میں
بچھ گئے پھول صبا لوٹ گئی

☆

بال کھولے جو یار آتا ہے
گھر کے ابر بہار آتا ہے

☆

تم کو آتا ہے پیار پہ غصہ
مجھ کو غصہ پہ پیار آتا ہے

☆

شور محشر امیؔر کو نہ جگا
سو گیا ہے غریب سونے دے

داغؔ دہلوی، امیؔر مینائی اور ان کے بے شمار شاگردوں نے غزل میں سادہ اور عام فہم زبان کے استعمال سے غزل کو مقبول عام بنا دیا، لیکن یہ غزل پرانی قدروں اور

پرانی واضعداریوں کی غزل تھی ۔دھیرے دھیرے حالات بدل رہے تھے۔ نہ وہ دربار تھے نہ وہ بازار تھے اور نہ وہ عشق کے آزار تھے۔

سارے ہندوستان پر انگریزی حکومت قائم ہوچکی تھی ۔ نئی زحمتیں، آفتیں سروں پر آن پڑی تھیں اور نئی زندگی کی برکتیں ابھی بہت دور تھیں۔ سرسید کے دکھے دل اور سوچتے دماغ نے علی گڑھ میں ایک علمی ادارہ قائم کردیا تھا جس میں انگریزوں سے نفرتیں نہیں بلکہ نئی دنیا نئی زبان اور نئے عہد کی برکتوں سے آنکھیں ملانے کا حوصلہ پیدا کیا جارہا تھا۔ سرسید کی آواز کو یقیناً خواجہ الطاف حسین حالؔی نے لبیک کہا اور علی گڑھ میں جو جدید زندگی کا چھوٹا سا مدرسہ قائم ہوا تھا وہ صرف ایک بڑی یونیورسٹی نہیں بلکہ آنے والی زندگی اور پوری دنیا سے وابستگی اور اس کی نئی تبدیلیوں سے آنکھیں ملانے کا پہلا قدم تھا۔ جہاں سے ادب اور زندگی کی نئی دنیا کا آغاز ہونے لگا تھا۔

اس کے ساتھ ہی **خواجہ الطاف حسین حالؔی** کی مقصدی شاعری کا دور شروع ہوا۔ جوانی میں دلّی آگئے تھے۔ شیفتؔہ اور غالبؔ سے مشورۂ سخن کیا۔ شاعری کی ابتداء قدیم طرز سے شروع کی تھی۔ سرسید سے ملاقات کے بعد رنگ بدل گیا۔ حالؔی کی مقصدی نظمیں بہت مشہور ہوئیں جن میں نئی دنیا کے اثرات نظر آرہے تھے۔ حالؔی کو شمس العلماء کے خطاب سے بھی نوازا گیا۔ حالؔی کی وفات ۱۹۱۴ء میں ہوئی۔

حالؔی نے سرسید کی نظریۂ زندگی اور نظریۂ شعر و ادب کو اپنے طور پر وضاحتی انداز میں تخلیق کیا۔ حالؔی کی یہ مقصدی شاعری ایک نئے لہجے کی آہٹ ہے۔ شعر دیکھئے:۔

ہم کو نسبت پہ فخر ہے تیری
تو گئی بھول ہم کو خاکِ حجاز

☆

کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں

مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں

☆

وہ تو بھولے تھے ہمیں ہم بھی اُنھیں بھول گئے

ایسا بدلا ہے نہ بدلے گا زمانہ ہرگز

☆

غالبؔ و شیفتہؔ و نیّر و آزردہ و ذوقؔ

اب دکھائے گا یہ شکلیں نہ زمانہ ہرگز

حالیؔ کے دیوان میں غزل کے لاتعداد شعر موجود ہیں جو مقصدی ہونے کے باوجود غیر جمالیاتی نہیں ہیں:۔

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں

اب ٹھہرتی ہے دیکھئے جا کر نظر کہاں

☆

داستان گل کی خزاں میں نہ سنا اے بُلبُل

ہنستے ہنستے ہمیں ظالم نہ رُلانا ہرگز

☆

حالیؔ نشاط نغمہ وے ڈھونڈتے ہو اب

آئے ہو وقتِ صبح رہے رات بھر کہاں

سرسید، حالیؔ اور ان کے ہم نوا نئی زندگی اور نئی تعلیم سے آنکھ ملاتے ہوئے زندگی اور ادب میں نیا شعور لائے اور جہاں سرسید نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی شکل میں تعلیمی ادارہ دیا وہیں حالیؔ نے اپنے طور پر مغربی زبان و ادب سے استفادہ کرنے کی بھرپور حمایت کی۔ اس کا یہ فائدہ ہوا کہ عالمی طور پر جو تبدیلیاں ادب میں آتی رہیں اس سے اردو ادب کے بہت سے باشعور فنکار وابستہ رہے۔

حسن و عشق کی اکہری شاعری منہ کا مزہ تو بدل دیتی تھی لیکن ایسی شاعری زندگی کے بدلتے ہوئے مسائل کا حل نہیں ہے۔ مثلاً ریاضؔ کا یہ شعر:۔

پاؤں تو ان حسینوں کا منہ چوم لوں ریاضؔ

آج ان کی گالیوں نے بہت ہی مزہ دیا

اسی دور میں اپنی پرانی تہذیب کی محبت میں اور تیزی سے بدلتی ہوئی انگریزی سے متاثر زبان اور زندگی کا بھرپور مذاق اکبر الہ آبادی نے اڑایا:۔

شیخ صاحب خدا سے ڈرتے ہیں

میں تو انگریز ہی سے ڈرتا ہوں

(اکبر الہ آبادی)

☆

حرم والوں سے کیا نسبت بھلا ہم اہلِ ہوٹل کو

وہاں قرآن اترا ہے یہاں انگریز اترے ہیں

☆

رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں
کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

**علامہ شیخ محمد اقبال:** ۱۸۷۶ء میں سیالکوٹ میں پیدا ہوئے اور ۱۹۰۵ء میں وہ بغرض تعلیم یورپ چلے گئے۔ یقیناً انہوں نے انگریزی بھی پڑھی اور مغربی تہذیب سے بھی آشنا ہوئے لیکن ان کے یہاں اسلام کی فعال قدروں کو عالمی اسلامی رویہ بتایا۔ انہوں نے واضح طور پر اپنی شعر و شاعری میں یہی کہا کہ نئی تہذیب کیوں کہ خدا اور مذہب کے تصوّر سے دھیرے دھیرے دور ہو رہی ہے اور سائنسی اور مادّی حقیقتوں کو سب کچھ سمجھ رہی ہے، یہ ادھورا ادراک ہے۔ خدا کے تصوّر اور مذہب کے تصوّر کے بغیر ہر تہذیب جھوٹی ہے اور وہ زندگی کو خودکشی کی طرف لے جا رہی ہے۔

تمھاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا، ناپائدار ہوگا

وہ دل کی آنکھوں سے دنیا کو دیکھتے تھے۔ دنیاوی عقل کو وہ دل سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے۔ اگرچہ عقل بھی ایک اہم ضرورت ہے۔ اس عقل اور دل کے مسلۂ کو انہوں نے اس طرح حل کیا ہے:۔

اچھا ہے دل کے پاس رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

اقبال کی غزل ایک لحاظ سے غزل کی تاریخ میں اس لئے منفرد ہے کیوں کہ اُن کے یہاں زندگی ہر دم رواں دواں ہے اور واضح طور پر اسلامی فلسفۂ فکر کو غزل میں پیش کیا ہے۔ اقبال اپنے سامنے ایک مقصد رکھتے تھے۔ اسی وجہ سے اقبال کی غزل کا

مرکزی کردار مردمومن اور انسان کامل ہے۔ خودی اس کی شناخت ہے۔ مثلاً ۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

☆

درویش خدا مست نہ شرقی نہ غربی
گھر میرا نہ دلّی نہ صفاہاں نہ سمر قند

☆

خودی کی شوخی و تندی میں کبر و ناز نہیں
جو ناز بھی ہو تو بے لذّت نیاز نہیں

☆

یقیں محکم، عمل پیہم محبت فاتح عالم
جہاد زندگانی میں یہ ہیں مردوں کی شمشیریں

☆

گراں بہا ہے تو بس اک خودی سے ہے ورنہ
گہر میں آب گہر کے سوا کچھ اور نہیں

☆

میں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیر اُمم کیا ہے
شمشیر و سناں اول طاؤس و رُباب آخر

بقول احمد ندیم قاسمی کے کہ:۔

''اقبالؔ نے قارئین شاعری کو ایک بالکل نئی اور منفرد ڈکشن سے متعارف کرایا اور غزل میں دنیا جہاں کے متنوع اور متفرق موضوعات کو سمو دینے کا گر بھی سکھایا۔ اقبالؔ کی غزل ان کی نظم کے بہت قریب سہی اور اس میں میرؔ و غالبؔ کی سی محسوساتی سحر آفرینیاں کم سہی مگر اردو غزل کو جدید بنانے کی مہم میں اقبالؔ کا کنٹری بیوشن بے حساب ہے''۔

(جدید اردو غزل ۱۹۴۰ء کے بعد صفحہ ا۔ خدا بخش اورینٹل لائبریری پٹنہ)

ابتداء میں اقبال کی غزل کی مخالفت بھی بہت ہوئی۔ لیکن ترقی پسند عہد آتے آتے تغزل کا معیار بدل گیا۔ مذہبی اور سیاسی افکار غزل کے مخصوص آداب میں نظر آنے لگے۔

اقبالؔ سے پہلے کسی شاعر نے مذہب کو کلیدی اہمیت نہیں دی۔ پرانے شاعروں کے یہاں چاہے عشق حقیقی ہو یا عشق مجازی اس کا سلسلہ شریعت سے نہیں جوڑا جاتا تھا۔ مسلمان شعراء بھی اپنی بات کہنے کے لئے عشق کا استعارہ استعمال کرتے تھے اور اس عشق کے دو سلسلے تھے۔ عشق حقیقی جو خدا سے ہے اور اس میں شریعت سے زیادہ تصوّف سے مدد لیتے تھے۔ دوسری شناخت انسانی حسن، محبت، بے غرض رشتے، محبت میں ایثار اور دنیاداری سے دوری کے موضوعات اعلیٰ غزل کی روح اور جان ہوتے تھے۔ اقبالؔ کے مطالعہ کے بغیر اگر ترقی پسند غزل کا تجزیہ کریں گے تو وہ نامناسب ہوگا اور اس کے بعد آج کی ہندوستان اور پاکستان کی غزل نے اپنا سید ھا رشتہ آج کے انسان سے جوڑنے کی کوشش کی ہے۔ اقبالؔ کی شاعری کا پہلا مجموعہ بانگ درا ہے۔ اس میں ان کی

وہ غزلیں بھی شامل ہیں جو انہوں نے روایتی انداز میں کہیں اور وہ بھی موجود ہیں جو انھوں نے فلسفیانہ انداز اور فارسی تراکیب کے استعمال کے ساتھ کہیں ہیں۔ ابتداء میں اقبالؔ نے داغؔ سے متاثر ہو کر جو غزلیں کہیں ان کے چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں :۔

نہ آتے ہمیں اس میں تکرار کیا تھی
مگر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی
تمھارے پیامی نے سب راز کھولا
خطا اس میں بندے کی سرکار کیا تھی
کہیں ذکر رہتا ہے اقبالؔ تیرا
فسوں تھا کوئی تیری گفتار کیا تھی
بھری بزم میں اپنے عاشق کو تاڑا
نظر تیری مستی میں ہشیار کیا تھی

اقبالؔ کے ہم عصروں اور ان کے بعد کے شاعروں میں صفی لکھنوی، عزیز لکھنوی، ثاقب لکھنوی سے لیکر آرزو لکھنوی اور اثر لکھنوی تک غزل براہ راست میرؔ و غالبؔ اور سوداؔ کی روایتوں سے جڑی رہی۔

**صفی لکھنوی:** کی پیدائش ۱۸۶۲ء میں لکھنؤ میں ہوئی۔ انہوں نے ۸۸ سال کی عمر پائی ۔ ۱۹۵۰ء میں ان کی وفات ہوئی۔ ان کا اصلی نام سید علی نقی صفی تھا۔ ان پر بھی نئی نظموں کا اثر تھا لیکن ان کی شناخت دراصل صرف ان کی غزلیں ہیں اور وہ بھی لکھنؤ اسکول کے مخصوص مزاج کی عکاسی کرتی ہیں۔ ان کے بہت سے شعروں میں عاشق کی ناکامی، نامرادی اور دردمندی نظر آتی ہے۔ مثلاً

تو بھی مایوس تمنا میرے انداز میں ہے
جب تو یہ درد پپیہے تیری آواز میں ہے

☆

کل ہم آئینے میں رخ کی جھریاں دیکھا کئے
کاروانِ عمرِ رفتہ کے نشاں دیکھا کئے

☆

غزل اس نے چھیڑی مجھے ساز دینا
ذرا عمر رفتہ کو آواز دینا

دراصل صفی کی غزل اور ان کے ہم عصر عزیزؔ لکھنوی کی غزل بول چال کی لکھنوی زبان اور مزاج کی خوبصورت ترجمان ہے۔ مرزا عزیزؔ لکھنوی کا تعلق علم دوست خاندان سے تھا۔ جدید رجحانات سے زیادہ قدیم رنگ تغزل پر زور دیتے تھے۔

**عزیز لکھنوی:** کی پیدائش ۱۸۸۲ء میں لکھنؤ میں ہوئی اور وفات ۱۹۳۵ء میں ہوئی۔ ان کے اشعار ملاحظہ ہوں :

ان کو سوتے ہوئے دیکھا تھا دم صبح کہیں
کیا بتاؤں جو ان آنکھوں نے سماں دیکھا ہے

☆

اپنے مرکز کی طرف مائلِ پرواز تھا حُسن
بھولتا ہی نہیں عالم تری انگڑائی کا

☆

عہد میں تیرے ظلم کیا نہ ہوا
خیر گزری کے تو خدا نہ ہوا

☆

حادثے دو ہی زمانے میں اہم گزرے ہیں
میرا مرنا، تیری زلفوں کا پریشاں ہونا

**ثاقبؔ لکھنوی:۔** کی پیدائش ۱۸۶۹ء میں آگرے میں ہوئی اور لکھنؤ میں پرورش پائی۔ ان کی وفات ۱۹۵۴ء میں ۸۵ سال کی عمر میں ہوئی۔ ثاقبؔ لکھنوی عزیزؔ لکھنوی کے ہم عصروں میں ہیں انہوں نے خود ایک جگہ لکھا ہے کہ وہ چاہتے ہیں کہ غزل میں زبان میرؔ کی سی ہو اور تخیل غالبؔ کا سا ہو ثاقب کے اِن کامیاب شعروں کو اردو شاعری میں حیاتِ جاوداں حاصل ہے:۔

بڑے شوق سے سن رہا تھا زمانہ
ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

☆

مٹھیوں میں خاک لے کر دوست آئے وقت دفن
زندگی بھر کی محبت کا صلہ دینے لگے

☆

مری ناؤ اس غم کے دریا میں ثاقبؔ
کنارے پہ آہی لگی بہتے بہتے

☆

جز زمیں کوئے جاناں کچھ نہیں پیش نگاہ
جس کا دروازہ نظر آیا صدا دینے لگے

☆

نشیمن نہ جلتا نشانی تو رہتی
ہمارا تھا کیا ٹھیک رہتے نہ رہتے

☆

باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو میرے
جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے

**میرزا جعفر علی خاں آثر لکھنوی** کی پیدائش ۱۸۸۵ء میں لکھنؤ میں ہوئی۔ ۱۹۰۶ء میں بی اے پاس کیا۔ ۱۹۳۵ء میں کلکٹر ہوئے اور ۱۹۶۷ء میں وفات ہوئی۔ آثر لکھنوی، آرزو لکھنوی، مرزا یاس یگانہ چنگیزی دبستانِ لکھنؤ کے اہم شاعر شمار ہوتے تھے۔

عزیز لکھنوی کے شاگرد تھے لیکن میر کو انہوں نے اپنا قبلہ بتایا تھا۔ فراق گورکھپوری سے ان کی چشمک رہی۔ دونوں اساتذہ نے جو ایک دوسرے پر اعتراضات کئے ہیں۔ وہ ان دونوں کی غزل کے معائب اور محاسن کو سمجھنے کے لئے مددگار ہیں۔ فراق کا اپنا انداز تھا اور آثر لکھنوی کی لکھنوی تہذیب، ان کی شاعری میں نظر آتی ہے۔ مثلاً ؎

وہ گزرا اِدھر سے جو دیوانہ وار
چراغِ لحد جھلملانے لگے

میر کے رنگ میں ان کا یہ شعر بہت منفرد ہے اور مشہور زمانہ ہے ؎

یہ اتفاق تو دیکھو بہار جب آئی

ہمارے جوشِ جنوں کا وہی زمانہ تھا

☆

عشق سے لوگ منع کرتے تھے

جیسے کچھ اختیار ہے اپنا

لکھنؤ کا خاص انداز اس شعر میں ملاحظہ ہو :

یہیں سب کو ہر پھر کے آنا پڑے گا

محبت کو مرکز بنانا پڑے گا

**آرزو لکھنوی:** کی پیدائش ۱۸۸۹ء میں لکھنؤ میں ہوئی اور وفات ۱۹۵۱ء میں ہوئی۔ آرزو لکھنوی اس عہد کے غزل کے اہم شاعر تو ہیں ہی لیکن انہوں نے اپنے عہد کی زبان کو خالص اردو کا نام دے کر یہ ظاہر کیا کہ اردو پر جو فارسی اور عربی کے قدیم اثرات ہیں وہ نئے زمانے میں اردو زبان کو مقبول ہونے سے روکتے ہیں اور صحیح بات یہ ہے کہ وقت کے ساتھ کچھ لفظ بھلا دیئے گئے اور کچھ نئے پیدا ہوتے گئے اور کچھ کی قدر و قیمت بدلتی گئی۔

ان کا یہ شعر اردو کی غزل کی روایتوں سے بھی جڑا ہے اور نئی دنیا کی خود غرضی کی طرف اشارہ بھی کر رہا ہے۔

آرام کے ساتھی تھے کیا کیا جب وقت پڑا تو کوئی نہیں

سب دوست ہیں اپنے مطلب کے دنیا میں کسی کا کوئی نہیں

☆

بہتے آنسو تو روک لے جس نے

ندیوں کا بہاؤ روکا ہے

☆

کس نے بھیگے ہوئے بالوں سے یہ جھٹکا پانی

جھوم کے آئی گھٹا ٹوٹ کے برسا پانی

☆

غم دے تو دل بھی شمع کا پروردگار دے

جو ساری عمر ایک طرح سے گزار دے

مرزا یاس یگانہ چنگیزی کی پیدائش ۱۸۸۴ء میں ہوئی۔ اثر لکھنوی اور آرزو لکھنوی کے زمانے میں ہی مرزا یاس یگانہ چنگیزی بھی تھے۔ وہ بڑے منہ پھٹ شاعر تھے اس وجہ سے تنقید کا نشانہ بن گئے کہ جب ان کا پہلا مجموعہ ۱۹۵۴ء میں شائع ہوا تو انہوں نے غالب پر اور غالب کی تقلید کرنے والوں پر بہت بے باکی سے اعتراض کئے اور اس مخالفت کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے سینکڑوں دشمن پیدا ہو گئے جس کا انہوں نے خود اعتراف کیا ہے:۔

"لکھنؤ نے تو میری وہ قدر کی کہ سبحان اللہ غلیظ گالیاں، ناپاک ہجویں، آبروریزی کی فکریں کیں۔"

(غزل سرا۔ مجنوں گورکھپوری صفحہ ۲۸۴)

یگانہ اپنی تحریروں، اپنی گفتگو میں اکثر اہم شاعروں کا اور بطور خاص غالب کا ذکر بڑی بے رحمی سے کرتے تھے۔ خاص طور پر اسی وجہ سے لکھنؤ کے شعراء متفق ہو کر ان

کی مخالفت کرتے تھے۔ مخالفت اگر ان کی شاعری یا ادبی نظریہ ہی تک محدود رہتی تو کوئی ہرج نہیں تھا لیکن یہ ادبی اختلاف بہت عوامی سطح پر آگیا اور لکھنؤ اس بات کے لئے مشہور تھا کہ وہاں اساتذہ کی الگ الگ پارٹیاں بن جاتی ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ زیادتی کرنا تماشبینوں کے لئے غیر سنجیدہ ماحول مہیا کر دیتا تھا۔ یگانہ کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ جہاں تک غزل گوئی کا سوال ہے ان کی غزل میں ایک خاص کیفیت ہے جو دل پر اثر کرتی ہے ان کے لہجے میں ایک مردانہ خودداری ہے لیکن کبھی کبھی وہ پرشور ہو کر حدِّ ادب سے آگے بڑھ جاتی ہے پھر بھی ان کے بہت سے شعر ایسے ہیں جو ان کی انفرادیت کا مکمل اظہار ہیں۔

ایسا رونا بھی کوئی رونا ہے
آستیں آنسوؤں سے تر نہ ہوئی

☆

جو خاک کا پتلا وہی صحرا کا بگولہ
مٹنے پہ بھی اک ہستی برباد رہے گی

☆

گھل گئے جیسے موم کی مریم
کیوں بڑھایا تھا دل جلوں سے تپاک

☆

مجھے دل کی خطا پر یاسؔ شرمانا نہیں آتا
پرایا جرم اپنے نام لکھوانا نہیں آتا

☆

مصیبت کا پہاڑ آخر کسی دن کٹ ہی جائے گا

مجھے سر مار کے تیشے سے مر جانا نہیں آتا

☆

خدا ہی جانے یگانہ میں کون ہوں کیا ہوں

خود اپنی ذات پہ شک دل میں آئے ہیں کیا کیا

یگانہ کا یہ شعر بطور خاص ان کے لہجے اور مزاج کی نمائندگی کرتا ہے۔

کہاں یہ بھوک کے مارے کہاں یہ حکم نماز

وہ کام بھی ہے کوئی کام جس میں جی نہ لگے

مرزا یاس یگانہ چنگیزی کی وفات ۱۹۵۶ء میں ہوئی۔

لکھنؤ اور دہلی کے ان اساتذہ کے بعد شاد عظیم آبادی پٹنہ اسکول کے ہیں

**شاد عظیم آبادی:۔** خان بہادر سید علی محمد شاد عظیم آبادی پٹنہ اسکول کے بڑے اہم شاعر ہیں۔ شاد ۱۸۴۶ء میں عظیم آباد میں پیدا ہوئے اور وفات ۱۹۲۷ء میں ہوئی۔ ان کی شاعری میں عورت ایک گھریلو لڑکی کا حسن، لباس اور سادگی لے کر آتی ہے:۔

کالی گھٹائیں باغ میں جھولے دھانی ڈوپٹے لٹ چھٹکائے

مجھ پہ قدغن آپ نہ آئیں اُف ری جوانی ہائے زمانے

پچھلے پہر اُٹھ اُٹھ کے نمازیں ناک رگڑنی سجدے پہ سجدے

جو نہیں جائز اس کی دعائیں، اُف ری جوانی ہائے زمانے

شادؔ عظیم آبادی کے بعد جگرؔ، حسرتؔ اور فراقؔ تین ایسے بڑے اور اہم شاعر ہیں جن کا غزل میں ایک منفرد انداز تو ہے ہی اپنی اپنی جگہ منفرد لہجہ بھی ہے۔ قدیم غزل کے کئی سو برس کے سفر کے بعد نئی غزل کا آغاز ہوا جس میں حُسن قدیم کے ساتھ ساتھ نیا عصری رنگ و آہنگ بھی شامل تھا۔ ان شعراء کی سب سے خاص بات یہ ہے کہ ہماری آج کی غزل کے یہ لوگ پیش رو ہیں۔

جگرؔ مرادآبادی کا پورا نام علی سکندر جگرؔ تھا اور ۱۸۹۰ء میں مرادآباد میں پیدا ہوئے اور ۱۹۶۰ء میں وفات پائی۔ جگرؔ کی غزل میں جذبات اور احساسات کا بہت زیادہ دخل ہے۔ ان کی غزلیں جذبۂ محبت میں ڈوبی ہوئی نظر آتی ہیں۔ جگرؔ کی خوبی ہے کہ انہوں نے تہذیب کی روایات کو اپنے تخلیقی مزاج سے ہم آہنگ کیا اور اس کے ساتھ ساتھ محبت کے پیغام کو عام کیا۔ جگرؔ کا نئے مزاج کا شعر ملاحظہ کیجئے :۔

ان کا جو کام ہے وہ اہلِ سیاست جانیں
میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے

جگرؔ مرادآبادی کو شہنشاہِ تغزل کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ داغؔ دہلوی کے شاگرد تھے۔ چھوٹی بحر میں اکثر بے حد خوب صورت اور پُر تاثیر غزلیں لکھی ہیں۔ لہجہ کی تازگی ان اشعار سے ظاہر ہوتی ہے :۔

اگر نہ زہرہ جبینوں کے درمیاں گذرے
تو پھر یہ کیسے کٹے زندگی کہاں گذرے
مجھے یہ وہم رہا مدّتوں کے جرأت شوق
کہیں نہ خاطر معصوم پر گراں گذرے

ہر اک مقام محبت بہت ہی دلکش تھا
مگر ہم اہل محبت کشاں کشاں گذرے
اسی کو کہتے ہیں جنّت اسی کو دوزخ بھی
وہ زندگی جو حسینوں کے درمیاں گذرے
بہت لطیف مناظر بھی حُسنِ فطرت کے
نہ جانے آج طبیعت پہ کیوں گراں گذرے
بہت حسین سہی صحبتیں گلوں کی، مگر
وہ زندگی ہے جو کانٹوں کے درمیان گذرے
بہت عزیز ہے مجھ کو اُنھیں کی یاد جگؔر
وہ حادثاتِ محبت جو ناگہاں گذرے

☆

دل کو برباد کر کے بیٹھا ہوں
کچھ خوشی بھی ہے کچھ ملال بھی ہے

☆

کوئی حسیں، حسیں ہی ٹھہرتا نہیں جگؔر
باز آئے اس بلندئ ذوقِ نظر سے ہم

☆

ان کے بہلائے بھی نہ بہلا دل
رائیگاں سعئِ التفات گئی

☆

حسن کی سحر کاریاں عشق کے دل سے پوچھئے
وصل کبھی ہے ہجر سا، ہجر کبھی وصال سا

☆

گلے مل کر وہ رخصت ہو رہے ہیں
محبت کا زمانہ آ رہا ہے

☆

صبا یہ ان سے ہمارا پیام کہہ دینا
گئے ہو جب سے یہاں صبح شام ہی نہ ہوئی

☆

آ کہ تجھ بن اس طرح اے دوست گھبراتا ہوں میں
جیسے ہر شئے میں کسی شے کی کمی پاتا ہوں میں

☆

محبت میں اک ایسا وقت بھی دل پر گزرتا ہے
کہ آنسو خشک ہو جاتے ہیں طغیانی نہیں جاتی

☆

وہ یوں دل سے گزرتے ہیں کہ آہٹ تک نہیں ہوتی
وہ یوں آواز دیتے ہیں کہ پہچانی نہیں جاتی

☆

کدھر سے برق چمکتی ہے دیکھیں اے واعظ
میں اپنا جام اٹھاتا ہوں تُو کتاب اٹھا

☆

سب کو مارا جگر کے شعروں نے
اور جگر کو شراب نے مارا

جگر صاحب کی ان غزلوں میں اپنے عہد کی بہت سی سیاسی اور سماجی تبدیلی اور عصری حسیّت کا کوئی واضح اعلان نہیں ہے۔ یہ رویہ اس بات کا پتہ دیتا ہے کہ غزل کی زبان ایک مخصوص تہذیبی پردہ دار زبان ہے اس سے انحراف کے بعد غزل غزل نہیں رہ جاتی۔ اس دور کے دوسرے اہم ترین شاعر فراقؔ ہیں۔

**فراق گورکھپوری** کی پیدائش ۱۸۹۶ء اور وفات ۱۹۸۲ء میں ہوگئی تھی۔

رگھوپتی سہائے فراقؔ گورکھپوری الہ آباد یونیورسٹی میں انگریزی کے پروفیسر تھے۔ فراقؔ غزل کے بہت اہم شاعر ہیں۔ ان کے بلند ترین شعر وہی ہیں جو حسن و عشق کی نزاکتوں نفاستوں کے پاس دار ہیں۔ فراقؔ کا تعلق سیاست سے بھی تھا لہٰذا انھوں نے غزل میں کچھ ایسے شعر بھی کہے جس میں جنگ آزادی کی تحریک کا اثر بھی ہے۔ مثلاً

قفس سے چھٹ کے وطن کا سراغ بھی نہ ملا
وہ رنگ لالہ و گل تھا کہ باغ بھی نہ ملا

دراصل فراقؔ حسن و عشق کی نزاکتوں، رحمتوں اور برکتوں کے شاعر ہیں جن کی مثالیں مندرجہ ذیل ہیں۔

ہم سے کیا ہو سکا محبت میں
تو نے تو خیر بے وفائی کی

☆

بسا اوقات دل کے ساتھ بارِ غم اٹھانے میں

سنا ہے حسن بھی اپنی نزاکت بھول جاتا ہے

فراقؔ گورکھپوری اگرچہ قدیم غزل کے سچّے وارث ہیں لیکن ان کے شعروں میں حسن کی ایسی سراپا نگاری ہے جس میں نیا پن ہے اور لہجہ میں بھی کچھ ہندی لہجہ کا رچاؤ بڑے خوب صورت ڈھنگ سے ملتا ہے۔ مثلاً

دھیمی لے جیسے کھل پڑے اک بار

روپ کا یہ رچاؤ اور نکھار

☆

قامت ہے کہ کہسار پہ چڑھتا ہوا دن ہے

جوبن ہے کہ ہے چشمۂ خورشید میں طوفان

کہا جاتا ہے کہ فراقؔ نے جنگ آزادی کے سلسلے میں کچھ تحریری اور تقریری اور کچھ عملی حصّہ لیا تھا لیکن ان کی غزل حسن و عشق کی خوبصورت اور شاعرانہ اظہار ہے۔ جس میں اپنے دور کے بہت سے رویہ بھی نظر آتے ہیں ایسا لگتا ہے کہ حسن پردہ دار دریچوں سے باہر نکل کر کچھ چھپا چھپا نظر آرہا ہے۔ فراقؔ کے یہاں ایسے بھی بہت سے شعر ہیں جن کے بغیر ہماری غزل کی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی:۔

نہ رہا حیات کی منزلوں میں وہ فرق ناز نیاز بھی

کہ جہاں ہے عشق برہنہ پا وہیں حسنِ خاک بسر بھی ہے

☆

مٹا مٹا کے محبت سنوار دیتی ہے
بگڑ بگڑ کے یونہی زندگی بنائے جا

☆

تھی یوں تو شام ہجر مگر پچھلی رات کو
وہ درد اٹھا فراقؔ کہ میں مسکرا دیا

☆

اب دور آسماں ہے نہ دور حیات ہے
اے درد ہجر تو ہی بتا کتنی رات ہے

☆

غرض کہ کاٹ دیئے زندگی کے دن اے دوست
وہ تیری یاد میں ہوں یا تجھے بھلانے میں

**حسرت موہانی کی پیدائش ۱۸۸۰ء میں ہوئی اور وفات ۱۹۵۱ء میں۔**

حسرتؔ موہانی غزل گو بھی تھے اور غزل کے پارکھ بھی تھے۔ اسی لئے ''مولانا سید فضل الحسن حسرتؔ موہانی رئیس المتغزلین کہلاتے تھے۔ (خوشبوئے چمن۔ انتخاب اشوک ساہنی صفحہ ۳۶۰)

حسرت موہانی خالص غزل کے اہم ترین شاعر تھے۔ ان کے حسن و عشق کے اشعار خوب صورت اور منفرد ہیں۔ غزل کی شاعری حسرتؔ موہانی تک آتے آتے بازار سے گھر میں آ گئی ہے اور ایسی بھولی سی لڑکی بن گئی جسے ہم خالہ زاد یا ماموں زاد بہن کہیں۔ مثلاً ؎

دو پہر کی دھوپ میں میرے بلانے کے لیے
وہ تیرا کوٹھے پہ ننگے پاؤں آنا یاد ہے
کھینچ لینا وہ مرا پردے کا کونا دفعتاً
اور دوپٹے سے ترا وہ منہ چھپانا یاد ہے
تجھ سے کچھ ملتے ہی وہ بیباک ہو جانا مرا
اور ترا دانتوں میں وہ انگلی دبانا یاد ہے

☆

حال کھل جائے گا بے تابیِ دل کا حسرتؔ
بار بار آپ انھیں شوق سے دیکھا نہ کریں

☆

حسن بے پرواہ کو خود بین و خود آرا کر دیا
کیا کیا میں نے جو اظہار تمنا کر دیا

☆

نہیں آتی تو یاد ان کی مہینوں تک نہیں آتی
مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

اگر ہم میرؔ اور غالبؔ کے سلسلے کے ساتھ ان کا مطالعہ کریں تو یہ بات بالکل صاف نظر آجائے گی کہ حسرتؔ نے حسن و عشق کے شعر کو حسن و عشق کی زبان میں لکھا ہے اور جنگ آزادی کو بڑی حد تک غزل میں جگہ نہیں دی جبکہ حسرتؔ موہانی کا تحریک آزادئ ہند کے عظیم قائدین میں شمار ہوتا ہے۔

حسرت نے میر و غالب کی غزل سے اثرات قبول کئے ۔ بلا شبہ ان کا محبوب، حسنِ بازاری نہیں ہے اور اکثر شعر محبوب کے اس حسن کی تصویر کشی کرتے ہیں جسے ان کا محبوب ان کے اپنے زمانے کی کوئی خاندانی لڑکی ہے ۔

ہم خوب سمجھتے ہیں حسرت سے تیری باتیں
اقرار کا پردہ ہے انکار نہیں تیرا

☆

مانوس ہو چلا تھا تسلی سے حالِ دل
پھر تو نے یاد آ کے بدستور کر دیا

☆

حیرت غرور حسن سے، شوخی سے اضطراب
دل نے بھی تیرے سیکھ لئے ہیں چلن تمام

☆

سب نے چھوڑا تجھے مگر حسرت
درد کی غمگساریاں نہ گئیں

☆

نگاہِ یار جسے آشنائے راز کرے
وہ اپنی خوبی قسمت پہ کیوں نہ ناز کرے

حسرت، جگر اور فراق کے عہد کے بعد ترقی پسندی کے عروج کے اہم نام فیض احمد فیض (پیدائش ۱۹۱۱ء اور وفات ۱۹۷۳ء) مجروح سلطان پوری (پیدائش ۱۹۱۸ء

وفات ۲۰۰۰ء)، سردار جعفری، کیفی اعظمی اور معین احسن جذبؔی (پیدائش ۱۹۱۲ء وفات ۲۰۰۵ء) کے ہیں۔ وہ صرف مارکسی نظریۂ حیات کو مانتے تھے۔ ترقی پسند ہونے کی وجہ سے مارکس اور لینن کی نظریات سے متاثر نظر آتے ہیں۔

فیض احمد فیض، مجروحؔ اور جذبؔی یا ان کے عہد کے چھوٹے بڑے شاعروں کے اشتراکی نظریات کی تشہیر سے قطعِ نظر ان کے یہاں ایسے اشعار بھی ملتے ہیں جو غزل کے قافلے کی رہنمائی اپنی جدید شعریت اور حسیّت کی وجہ سے کرسکتے ہیں۔ مثلاً فیض احمد فیضؔ کے اشعار ملاحظہ ہوں :۔

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے

☆

ادائے حسن کی معصومیت کو کم کر دے
گناہ گار نظر کو حجاب آتا ہے

☆

دونوں جہان تیری محبت میں ہار کے
وہ جا رہا ہے کوئی شبِ غم گزار کے

فیضؔ کی غزل میں کلاسیکی رنگ و آہنگ کا غلبہ ہے:۔

درد اتنا ہے کہ ہر رگ میں ہے محشر برپا
اور سکوں ایسا کہ مرجانے کو جی چاہتا ہے

کئی بار اس کا دامن بھر دیا حسنِ دو عالم سے
مگر دل ہے کہ اسکی خانہ ویرانی نہیں جاتی

اسی طرح مجروحؔ کے یہ شعر:۔

میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

☆

اب سوچتے ہیں لائیں گے تجھ سا کہاں سے ہم
اٹھنے کو اٹھ تو آئے تیرے آستاں سے ہم

☆

اور تہذیبِ غمِ عشق نبھادیں کچھ دن
آخری وقت میں کیا اپنے چلن کو بھولیں

معین احسن جذبیؔ کے یہ شعر (پیدائش ۱۹۱۲ء) ملاحظہ ہوں ۔

اے موج بلا انکو بھی ذرا دو چار تھپیڑے ہلکے سے
کچھ لوگ ابھی تک ساحل سے طوفاں کا نظارہ کرتے ہیں

☆

تمھارے جلووں کی رنگینوں کا کیا کہنا
ہمارے اجڑے ہوئے دل میں اک بہار تو ہے

☆

عشق کی معصومیوں کا یہ بھی اک انداز تھا
ہم نگاہِ لطفِ جاناں سے بھی شرمایا کئے

☆

مرنے کی دعائیں کیوں مانگوں، جینے کی تمنا کون کرے

یہ دنیا ہو یا وہ دنیا اب خواہشِ دنیا کون کرے

مجازؔ نے غزل کی طرف توجہ کم کی لیکن ان کے یہاں ایسے شعروں کی کمی نہیں ہے جن میں جگرؔ کے انداز کا والہانہ پن ہے:۔

سب کا تو مداوا کر ڈالا اپنا ہی مداوا کر نہ سکے

سب کے تو گریباں سی ڈالے اپنا ہی گریباں بھول گئے

☆

تمھیں تو ہو جسے کہتی ہے ناخدا دنیا

بچا سکو تو بچا لو کہ ڈوبتا ہوں میں

اس عہد کے ترقی پسند شاعروں سے متاثر ہوکر بھوپال کے بہت اچھے شاعروں میں اختر سعید خاں اور تاجؔ بھوپالی وغیرہ نے بھی ترقی پسند لب و لہجہ اختیار کیا کیوں کہ وہ اس وقت اس عہد کی ضرورت تھی کہ غریبوں پر ہونے والے ظلم کے خلاف لکھا جائے اور قابلِ تعریف بات یہ ہے کہ اِن دونوں نے اپنی ترقی پسند غزل میں کلاسیکل غزل کو زندہ رکھا اور جدید افکار سے غزل کو سجائے رکھا۔

اختر سعید خاں کی غزل کے نمائندہ اشعار پیش ہیں:۔

یوں تو ملنے کو کیا نہیں ملتا

کوئی درد آشنا نہیں ملتا

☆

مانا میں نے ایک نہ اک دن لوٹ کے تو آجائے گا
لیکن تجھ بن عمر جو گزری کون اسے لوٹائے گا

☆

اُٹھ تو آیا ہوں اُس کے در سے مگر
اپنے گھر کا پتہ نہیں ملتا

☆

اسی موڑ پر ہم ہوئے تھے جدا
ملے ہیں تو دم بھر ٹھہر جایئے

اختر سعید خاں کا بہت خوب صورت شعر ہے:۔

چراغوں سے کیا روشنی مانگئے
یہ دل ہے کسی کا بجھایا ہوا

اپنی فکر اور اظہار کے لحاظ سے یہ ایک خوبصورت شعر ہے۔ یہاں یہ اشارہ کرنا کہ لفظیات اور فکر میں اگر نغمگی، آہستگی اور انسانیت ہے تو کسی وقت ان لفظوں کے ملتے جلتے اشعار بالکل الگ مفہوم دیتے ہیں۔

اک کرن مہر کی ظلمات پہ بھاری ہوگی
رات ان کی ہے مگر صبح ہماری ہوگی

غزل میں وہ جہاں منفرد اور خوبصورت اظہار کا فن جانتے ہیں وہیں روایتی مضامین کو بھی اپنے ندرتِ بیان، نئے نئے منظر دکھاتے ہیں اور دل کی نئی نئی اور معیاری بستیاں بساتے ہیں۔

تاج بھوپالی بھی اس عہد کے اعلیٰ شاعر ہیں، ان کو ہر دور میں پسند کیا گیا۔
یہاں یہ کہنا بے جا نہیں ہوگا کہ کسی بھی عہد کے بڑے سے بڑے شاعر نے جب انسانیت اور انسانوں پر، طاقتور طبقے یا افراد کے ظلم کے خلاف آواز اُٹھائی ہے تو بڑے پُر اثر اشعار وجود میں آئے ہیں۔ تاج بھوپالی بہت سادہ انسان تھے، زبان صاف ستھری اور معصومیت کے ساتھ عام فہم ہوتی تھی:۔

تم اتنا حسن آخر کیا کرو گے
ارے کچھ تو خدا کے نام کرو

اچھی غزل کی بنیادی تعریف اسکی نغمگی، انسانیت پرستی اور تہذیبی اظہار ہے جو تاج بھوپالی کی غزل میں جگہ جگہ نظر آتی ہے:۔

درد سے چہرے کی تابانی بڑھی
گھر جلا تو آسمان روشن ہوا

☆

میں اکثر راستوں میں سوچتا ہوں
یہ بستی کوئی جنگل تو نہیں ہے

☆

پیچھے بندھے ہیں ہاتھ مگر شرط ہے سفر
کس سے کہیں کے پاؤں کے کانٹے نکال دے
میں تاج ہوں تو تو مجھے سر پہ چڑھا کے دیکھ
یا اسقدر گرا کے زمانہ مثال دے

☆

یہ تو انسانوں کے ٹوٹے ہوئے دل ہیں ساقی
ہم سے ٹوٹے ہوئے ساغر نہیں دیکھے جاتے

☆

عمر بھر پڑھئے عمر بھر لکھئے
یہ زمانہ کتاب جیسا ہے

☆

اگر تیشہ نہیں پتھر اُٹھالو
رہوگے کب تلک مظلوم لوگو

☆

وہ سامنے ہیں مگر منزلوں کی دوری ہے
غزل کے واسطے یہ فاصلہ ضروری ہے

جاں نثار اختؔر نے تاج بھوپالی کی کتاب ''خیمۂ گل'' میں اپنی رائے اس طرح لکھی۔

''تاؔج جو اپنے شہر بلکہ اپنے صوبہ کا سب سے مقبول اور ہر دلعزیز شاعر ہے کل ہندوستان گیر شہرت کا مالک ہوگا''۔

اس طرح ترقی پسندوں نے مقصدیت کے باوجود غزل کی غزلیت کو اور کلاسیکل غزل کو قائم رکھا ہے۔ وہ دہلی اور لکھنؤ کے قدیم مراکز کی غزل ہو یا سیتاپور جیسے گاؤں نما قصبے کی غزل ہو، بشیر بدر کی غزل ہو یا کہ احمد فراز کی غزل ہو۔ جن کے مشہور

شعر ہیں:۔

اُجالے اپنی یادوں کے ہمارے ساتھ رہنے دو
نہ جانے کس گلی میں زندگی کی شام ہو جائے

(بشیر بدر)

تو خدا ہے نہ میرا عشق فرشتوں جیسا
دونوں تنہا ہیں تو کیوں اتنے حجابوں میں ملیں

(احمد فراز)

اس تفصیل سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ غزل ہماری زندگی اور تہذیب کے ساتھ چلتی رہی اور اپنے عہد کے سیاسی اور سماجی نظریوں کی ترجمانی کرتی ہوئی بھی غزل کے بنیادی مزاج اور اسلوب سے بے تعلق نہیں ہوئی اور یہ سلسلہ جسے ہم جدید غزل کہتے ہیں وہ ایک جاری اور ساری عمل ہے جو امیر خسرو سے ۱۹۷۰ء تک ہندوستان کے تہذیبی مزاج کی بزبانِ غزل ترجمانی کرتی رہی ہے۔اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے، یہ بتانے کے لئے کہ جدید غزل میں علامتوں نے نئی معنویت اور نئی جہتوں کو پیش کیا ہے جس میں زندگی کی تازگی، اپنی زمین سے قربت اور اسکی سوندھی خوشبو سے محبت آج بھی موجود ہے۔

باب دوم

# جدید غزل کا آغاز اور اس کے نمائندہ شعراء

جدید غزل سے مراد غزل میں جدید افکار اور خیالات کے ساتھ ساتھ لہجے اور تیور میں جدّت کے علاوہ زندگی کی حقیقتوں، داخلی کیفیات کی حرف بہ حرف نمائندگی، سماج کی موشگاف عکّاسی بھی ہے۔ جدید غزل گو شعراء نے اپنی غزل کی بنیاد حقیقت نگاری پر، پُر خلوص داخلی جذبات کی تشہیر پر اور اپنے عہد کے حالات کی سیدھی عکّاسی پر رکھی ہے۔ وہ بڑی خوبی سے اپنے مشاہدات اور تجربات کو غزل میں اس طرح بیان کرتے ہیں کہ وہ ہر کسی کو اپنے دل کی بات اور خود پر گزری ہوئی کیفیات لگتی ہیں اور ان کا اس قدر خوبی کے ساتھ غزل میں ڈھل جانا حیران کُن بھی لگتا ہے۔

جدید غزل پر پروفیسر آل احمد سرور، ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی، احمد ندیم قاسمی، شمس الرحمٰن فاروقی، ڈاکٹر محمد حسن، ڈاکٹر یوسف حسین خاں وغیرہ نے مضامین لکھے ہیں۔ جدید اردو غزل اور اس کے شعراء کے بارے میں احمد ندیم قاسمی لکھتے ہیں:

> ''جدید شعراء کے اپنے انفرادی تیور ہیں جن میں سے نمایاں ترین تیور ان کی حقیقت پسندی ہے، زمین سے، مٹی سے ان کی محبت ہے۔''

اسی مضمون میں احمد ندیم قاسمی جدید غزل کے بارے میں مزید لکھتے ہیں:

> ''جدید اردو غزل کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس غزل میں

باطن اور ظاہر کے درمیان ایک عجیب ناقابل شکست قسم کا رابطہ
قائم ہوگیا ہے، یوں داخلیت اور خارجیت کی پرانی بحث کی
گنجائش ہی ختم ہوگئی ہے ـــ شاعری کرتے ہوئے شاعر ایسی
باتیں کہہ جاتے ہیں کہ سننے والا بظاہر ششدد بھی رہ جاتا ہے، مگر
اندر سے ثروت مند بھی ہو جاتا ہے۔ ہم حیران ہوتے ہیں کہ
کیسے بالکل سامنے کے مناظر اور بالکل سامنے کی باتوں کو ان
نوجوانوں کی فنی طلسم کاری فن پارہ بنا دیتی ہے۔''

(جدید اردو غزل ۔۱۹۴۰ کے بعد صفحہ ایک اور دو،
خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ)

جدید غزل کسی ایک رجحان کی نمائندگی نہیں کرتی۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی کہتے ہیں کہ:

''جدید تر غزل کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس غزل پر
آپ کسی قسم کا لیبل نہیں لگا سکتے۔ نہ کسی ایک صفت یا کیفیت کے
دائرے میں اس کو مقید کر سکتے ہیں۔''

(فنون لاہور، ۱۹۶۹ء، صفحہ ۔ ٦٦)

ڈاکٹر محمد حسین نے اپنے مضمون ''کچھ جدید غزل کے بارے میں'' ہندوستان اور پاکستان میں غزل کے مشہور شعراء کے نام لکھے ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں:

**ہندوستانی شعراء:-**

فراق گورکھپوری، جگر مرادآبادی، جاں نثار اختر، مجاز، جذبی، مجروح، خلیل

الرحمٰن اعظمی، شہریار، مظہر امام، کیفی اعظمی، بشیر بدر، وسیم بریلوی، نشور واحدی، حسن نعیم، سردار جعفری، روش صدیقی، ساحر وغیرہ۔

## پاکستانی شعراء:-

فیض احمد فیض، ابن انشاء، ناصر کاظمی، احمد مشتاق، حمایت علی شاعر، ظفر اقبال، احمد فراز، احمد ندیم قاسمی، شکیب جلالی، منیر نیازی، کشور ناہید، ادا جعفری، پروین شاکر مجید امجد، ناصر شہزاد وغیرہ۔ اس مضمون میں انہوں نے شہریار کے دو شعر لئے ہیں اور اپنی پسندیدگی کا اظہار بھی کیا ہے۔

عجیب حادثہ مجھ پر گزر گیا یارو
میں اپنے سائے سے کل رات ڈر گیا یارو

(شعر مشہور ہے۔ گو مجھے پسند نہیں)

(جدید اردو غزل ۱۹۴۰ کے بعد صفحہ نمبر ۸)

شہریار کا دوسرا شعر ہے ؎

جستجو جن کی تھی اس کو تو نہ پایا ہم نے
اس بہانے سے مگر دیکھ لی دنیا ہم نے

اپنے مضمون میں آگے لکھتے ہیں:

''پھر مشاعروں کو لوٹ لینے والے شاعر ہیں مگر ان کا بھی اپنا ایک آہنگ ہے۔ سب کا الگ الگ تذکرہ ضروری ہے مگر یہاں صرف بشیر بدر کا (شعر یہ ہیں):-

اُجالے اپنی یادوں کے ہمارے ساتھ رہنے دو
نہ جانے کس گلی میں زندگی کی شام ہوجائے

☆

کوئی ہاتھ بھی نہ ملائے گا جو گلے ملوگے تپاک سے
یہ نئے مزاج کا شہر ہے یہاں فاصلے سے ملا کرو''

(جدید اردو غزل ۱۹۴۰ء کے بعد صفحہ نمبر ۹ اور ۱۰)

ڈاکٹر یوسف حسین خاں اپنی کتاب ''اردو غزل'' (مطبوعہ معارف ۱۹۷۴ء پریس اعظم گڑھ) کے چوتھے ایڈیشن کے دیباچہ میں غزل گوشعراء کے جدید شعری رجحانات کے متعلق لکھتے ہیں:—

''ہمارے جدید شاعر مقصدیت اور اجتماعیت کے محرکوں کو چھوڑ کر باطنی خلش اور کرب اور وجدانی تجربوں کو ابھارنے کی کوشش کر رہے ہیں جو اس وقت عالمی ادب میں جدید ترین اندازِ فکر ونظر ہے۔''

ہندوستان میں جدیدیت کا آغاز ۱۹۵۵ء کے آس پاس ہوا اور جدید غزل کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نصاب میں ۱۹۶۸ء میں علیحدہ شکل میں شامل کیا گیا۔ اس وقت پروفیسر آل احمد سرور، صدر شعبہ اردو تھے۔ ''شب خون'' الہ آباد اور ''شاخسار'' کٹک کے ایڈیٹروں نے اپنے اداریوں میں محترم سرور صاحب کو اس بات کے لئے مبارکباد دی کہ جدید اردو غزل کو ایم اے کے نصاب میں شامل کیا گیا۔ ان رسالوں کے ایڈیٹروں نے یونیورسٹی کے نصاب کی نقل اپنے رسالوں میں چھاپی ۔ یہ نصاب ''شب

خون'' (الہٰ آباد)، ۱۹٦۸ء کے ایڈیٹر شمس الرحمٰن فاروقی نے صفحہ ٦۸ پر، کرامت علی کرامت نے ''شاخسار'' شمارہ ٦۹ (بہار) میں شائع کیا۔

''شب خون'' نومبر ۱۹٦۸ء کے صفحہ نمبر ۸٦ سے اس نصاب کا ایک حصہ نقل ہے:

''(۱) یگانہ، فراق کے بعد کی غزل، نیا عنصر اور نیا لہجہ

(۲) غزل کی نئی علامتیں اور نئے لفظی تلازمے۔

ناصر کاظمی، سلیم احمد عالی، احمد مشتاق، ظفر اقبال، شکیب جلالی، شہزاد احمد، احمد فراز، شہریار، بمل کرشن اشک، محمد علوی، بشیر بدر، ساقی فاروقی اور دوسرے۔''

(''شب خون'' ۱۹٦۸ء صفحہ ۸٦ شمس الرحمٰن فاروقی)

طلباء کو خاص طور سے جدید غزل سے متعارف کرانے کے مقصد لئے اسے نصاب میں شامل کیا گیا تھا۔ اسی لئے اس نصاب کا عنوان ''جدید تر غزل'' رکھا گیا کیوں کہ جو جدید غزل آج عوام کی پسند بن چکی ہے وہ اس وقت خواص یعنی ادبی حلقوں میں کسی حد تک پسند نہیں کی جا رہی تھی لیکن جب جدیدیت کے قابل قدر مفہوم نکلنا شروع ہوئے تو جدید غزل منظر عام پر آگئی اور اسے خواص نے بھی پسند کیا۔

جدید غزل کے مرکزی خیال اور اس کے اظہار کو جب قبول کر لیا گیا تو اس کے اظہار میں تبدیلیاں بھی آتی رہیں جو ادب میں ایک فطری عمل ہے۔ یہ تبدیلیاں جدید غزل کے نمائندہ شعراء کے فکر وفن میں بخوبی دیکھی جا سکتی ہیں جس کا تجزیہ آگے کیا جا رہا ہے۔

# ناصر کاظمی

پیدائش ۱۹۲۳ء　　　　وفات ۱۹۷۲ء

ناصر کاظمی ۱۹۲۳ء کو امبالہ میں پیدا ہوئے تھے۔ ناصر کاظمی کا اصلی نام ناصر رضا تھا۔ ۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند کے بعد لاہور چلے گئے۔ ۱۹۷۲ء میں لاہور (پاکستان) میں انتقال ہوا۔

ناصر کاظمی کی ابتدائی تعلیم امبالہ میں ہوئی۔ اسلامیہ کالج لاہور اور گورنمنٹ کالج لاہور سے تعلیم کے اعلیٰ مدارج طے کئے۔

ناصر کاظمی کے نانا سید نیاز نبی اور ان کی والدہ کنیزہ محمدؐ بیگم دونوں شاعری کرتے تھے اس لئے یہ کہنا کے ناصر کاظمی کو شاعری ورثہ میں ملی تھی غلط نہ ہوگا۔ ناصر کاظمی کی آواز بھی بہت اچھی تھی اور انہیں موسیقی بچپن سے پسند تھی۔ ناصر کاظمی کی اداس اور تاریک راتوں میں خیالات کے دریچوں سے نئے مضامین ان کے کلام کی زینت بن جاتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

کہاں ہے تو کہ تیرے انتظار میں اے دوست
تمام رات سلگتے ہیں دل کے ویرانے

☆

پھر جاڑے کی رُت آئی
چھوٹے دن اور لمبی رات
کوئی جب مل کے ہوا تھا رخصت
دلِ بے تاب وہی رات آئی

ناصر کاظمی کو قدرتی حسن سے عشق تھا لیکن ان کے ایسے عشق جن کی کسک انہوں نے ساری زندگی محسوس کی اس کو غزل کا حصّہ بھی بنایا۔ ان کی غزلیں جن میں اُداسی اور غم کی لہریں موجود ہیں سننے والوں کے دل پر اثر کرتی ہیں:—

دل تو میرا اداس ہے ناصؔر

شہر کیوں سائیں سائیں کرتا ہے

ناصر کاظمی اپنے دل کی اُداسی کو اس شعر میں اس طرح بیان کرتے ہیں جیسے گھر کے درودیوار ان کے غم میں شریک ہیں۔

ہمارے گھر کی دیواروں پہ ناصؔر

اُداسی بال کھولے سو رہی ہے

ناصر کاظمی نے دوست سے بچھڑ کر بلکہ ترکِ تعلق کے بعد بھی اُس کی کمی کو شدّت سے محسوس کیا ہے:

اے دوست ہم نے ترکِ تعلق کے باوجود

محسوس کی ہے تیری ضرورت کبھی کبھی

☆

گو ہجر کے لمحات بہت تلخ تھے لیکن

ہر بات بعنوانِ طرب یاد رہے گی

ناصر کاظمی کی غزل کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اداسی ان کی شاعری کی روح ہے۔

مجھے یہ ڈر ہے تیری آرزو نہ مٹ جائے

بہت دنوں سے طبیعت مری اداس نہیں

جدائیوں کے زخم درد زندگی نے بھر دئے

اسے بھی نیند آگئی مجھے بھی صبر آگیا

ناصر کاظمی کے اشعار پڑھ کر دل کی دھڑکن تیز ہونے لگتی ہے ان کی شخصیت اور شاعری میں مقناطیسی کشش تھی۔ ان کی شاعری اور شخصیت کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ دوسروں کے کام آکر بے حد خوشی محسوس کرتے تھے۔ ہر ملاقاتی سے اس طرح پیش آتے تھے کہ وہ ان کا گرویدہ ہوجاتا تھا۔ ایک شعر میں وہ خود بھی اجنبی سے ملنے کی خوشی اور حیرانی کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

گئے دنوں کا سراغ لیکر کدھر سے آیا کدھر گیا وہ

عجیب مانوس اجنبی تھا مجھے تو حیران کر گیا وہ

ناصر کاظمی نے زندگی کے معنی اور اس کی گہرائی کو بہت سنجیدگی سے سمجھا اور مختلف استعاروں اور علامتوں کے ذریعہ اس وقت کے حالات اور قلبی کیفیات کو نہایت کامیابی کے ساتھ بیان کیا۔ غم جاناں اور غم دوراں کی آمیزش بہت خوب صورت ہے:

اپنی دھن میں رہتا ہوں

میں بھی تیرے جیسا ہوں

تو جیون کی بھری گلی

میں جنگل کا رستہ ہوں

☆

دھیان کے آتش دان میں ناصرؔ

بجھے دنوں کا ڈھیر پڑا ہے

☆

کچھ یادگارِ شہرِ ستمگر ہی لے چلیں
آئے ہیں اس گلی میں تو پتھر ہی لے چلیں

☆

یوں کس طرح کٹے گا کڑی دھوپ کا سفر
سر پر خیالِ یار کی چادر ہی لے چلیں

☆

رنگ دکھلاتی ہے کیا کیا عمر کی رفتار بھی
بال چاندی ہو گئے سونا ہوئے رخسار بھی

☆

یہ کیا کہ روز ایک سا غم ایک سی امید
اس رنجِ بے خمار کی اب انتہا بھی ہو

ناصر کاظمی نے اپنی غزلوں میں، عصرِ حاضر کے حالات، جلی ہوئی بستیوں کا المیہ، سماجی مسائل، برباد اور لٹے ہوئے لوگوں کے غم کو اپنے مخصوص انداز میں پیش کیا ہے۔

شور برپا ہے خانۂ دل میں
کوئی دیوار سی گری ہے ابھی

☆

اس شہرِ بے چراغ میں جائے گی تو کہاں
آ اے شبِ فراق تجھے گھر ہی لے چلیں

☆

وقت اچھا بھی آئے گا ناصر
غم نہ کر زندگی پڑی ہے ابھی

☆

کہیں اُجڑی اُجڑی سی منزلیں کہیں ٹوٹے پھوٹے سے بام و در
یہ وہی دیار ہے دوستوں جہاں لوگ پھرتے تھے رات بھر

☆

ہر خرابہ یہ صدا دیتا ہے
میں بھی آباد مکاں تھا پہلے

ناصر کاظمی غزل کو بہت نازک اور لطیف شئے سمجھتے تھے۔ انسان کے اندر پیدا ہونے والی تبدیلیوں کو بھی انہوں نے بہت خوبصورتی سے غزل میں پیش کیا۔

یہ صبح کی سفیدیاں یہ دوپہر کی زردیاں
میں آئینے میں ڈھونڈتا ہوں میں کہاں چلا گیا

☆

یوں تو ہر شخص اکیلا ہے بھری دنیا میں
پھر بھی ہر دل کے مقدر میں نہیں تنہائی

☆

آرائشِ خیال بھی ہو دل کشا بھی ہو
وہ درد اب کہاں جسے جی چاہتا بھی ہو

☆

عمر بھر کی نوا گری کا صلہ

اے خدا کوئی ہم نوا ہی دے

☆

تیری گلی میں بہت دیر سے کھڑا ہوں مگر

کسی نے پوچھ لیا تو جواب کیا دوں گا

☆

یاد کے بے نشاں جزیروں سے

تیری آواز آ رہی ہے ابھی

ناصر کاظمی کی شاعری اور شخصیت پر لکھے گئے مضامین کا مجموعہ ''ہجر کی رات کا ستارہ'' کے نام سے طبع ہوا ہے اس میں پروفیسر حامد کاشمیری اپنے مضمون ''ناصر کاظمی کی شاعری'' کے عنوان سے صفحہ نمبر ۲۷ پر لکھتے ہیں:

''ذہن کی تخلیقی کیفیت میں سرشار ہونے کے ساتھ ہی ناصر کاظمی کا سارا وجود اسی نشے میں ڈوب جاتا ہے یہاں تک کہ شعور اور لاشعور کے فاصلے بھی سمٹ جاتے ہیں۔''

ناصر کا بہت جلد انتقال ہوگیا لیکن ان کی غزل خصوصاً پاکستان میں اس نئی غزل کا کامیاب نمونہ ہے، جو اپنے عہد کی اداسی کو بیان کرتی ہے۔ناصر کاظمی کی غزل دل کو چھونے والی غزل ہے۔ ناصر کاظمی کی بے وقت موت نے ایک ایسے شاعر کو ہم سے جدا کر دیا جو اس عہد کے ساتھ آسمانِ غزل کی رفعتوں اور سربلندیوں کو چھونے کا ہنر رکھتا تھا۔

یوں تو ناصر کاظمی نے تخلیقی طور پر میر سے فیض اٹھایا ہے لیکن ناصر کا اپنا الگ لہجہ ہے جو اپنی انفرادی پہچان رکھتا ہے۔

ناصر کاظمی جیسا غزل کا شاعر، کوئی پیدا ہوا یا نہیں ہوا یہ تو وقت ہی بتائے گا لیکن ان کی غزل کے نشانات ہر دور کی غزل میں ضرور نظر آئیں گے۔

دائم آباد رہے گی دنیا
ہم نہ ہونگے کوئی ہم سا ہوگا

ناصر کاظمی کے لئے انتظار حسین نے ''وہ تیرا شاعر وہ تیرا ناصر'' کتاب کے پیش لفظ میں صفحہ نمبر ۱۵ پر لکھا ہے۔

''وہ ایسا شاعر جس کے یہاں واقعہ اور تخیل کی حدیں آپس میں گھل مل گئی ہوں، وہ محقق کے بس کی چیز نہیں ہے۔''

ناصر کاظمی نے غزل کے علاوہ نظمیں اور ڈرامے بھی لکھے، اس کے علاوہ انہوں نے کئی شاعروں کا انتخاب بھی ترتیب دیا جن میں انتخابات میر، انتخابات نظیر، انتخابِ ولی اور انتخابِ انشاء قابل ذکر ہیں۔ ناصر کا پہلا شعری مجموعہ ''برگ نے'' ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا اس کے بعد ان کا ''دیوان'' اور دوسرا مجموعہ ''بارش'' ۱۹۷۲ء اور ۱۹۷۵ء میں شائع ہوئے۔ اس کے علاوہ ناصر کاظمی رسالہ ''اوراق'' اور ''ہمایوں'' کے مدیر رہے۔ ناصر کاظمی نے ۱۹۵۲ء میں ''خیال'' کے نام سے اپنا رسالہ جاری کیا۔

ناصر کاظمی کا تعلق ان بدلتے ہوئے سماجی حالات کی پیدا کردہ ذہنی کشمکش کرب سے تھا وہ ان جدید شعراء سے متعلق رہے جنھوں نے اپنے دلی جذبات اور موجودہ ماحول کی پیدا کردہ بے چینی کے علاوہ جدید خیالات اور تجربات کا اظہار غزل میں بڑی مہارت کے ساتھ کیا۔ اس عہد کے وہ شاعر جو ناصر کاظمی کے ساتھ اکثر مشاعروں

میں بھی شرکت کرتے تھے ان میں منیرؔ نیازی اور ابن انشاء خاص ہیں لیکن ناصر کا ایک الگ مقام ہے۔ ناصر نے اردو غزل میں جدید تجربے بھی کیے اور قابل قدر خوشگوار اضافے بھی کیے ہیں۔ ان کے چند نمائندہ شعر ملاحظہ کریں:

دیکھتے دیکھتے تاروں کا سفر ختم ہوا
سو گیا چاند مگر نیند نہ آئی مجھ کو

☆

زندگی جس کے دم سے ہے ناصرؔ
یاد اس کی عذابِ جان بھی ہے

☆

چڑھتے سورج کی ادا کو پہچان
ڈوبتے دن کی ندا غور سے سُن

☆

محبت کرنے والے کم نہ ہوں گے
تیری محفل میں لیکن ہم نہ ہوں گے

## ابن انشاء

پیدائش: ۱۰ جون ۱۹۲۶ء        وفات: ۱۱ جنوری ۱۹۷۸ء

ابن انشاء پاکستان کے اہم شاعر ہیں، غیر منقسم ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ وہ اپنی کتاب ''چاند نگر'' کے دیباچہ طبع اول میں لکھتے ہیں:

''میں نے شعر کہنا تو دس گیارہ برس کی عمر میں شروع کر دیا تھا
لیکن پہلی نظم اشاعت کے لئے ۱۹۴۳ء میں ایک ادبی پرچے میں
بھیجی قیام پاکستان تک کچھ نہ کچھ لکھتا اور چھپتا رہا لیکن سنجیدگی
سے شاعری کا آغاز ۱۹۴۹ء سے جاننا چاہئے۔''

ابن انشاء کے مجموعے ''اس بستی کے اک کوچے میں'' ''چاند نگر'' اور ''دلِ وحشی'' خاص طور پر مقبول خاص و عام ہیں۔ ابن انشاء نے غزل کے علاوہ گیت اور نظمیں بھی لکھیں ان کے سفر نامے بھی کافی مقبول ہیں جن کے نام ہیں:

''آوارہ گرد کی ڈائری''، ''چلتے ہو تو چین کو چلئے'' اور ''نگری نگری پھرا مسافر''۔ یہ تمام کتب لاہور اکیڈمی، ۲۰۵ سرکلر روڈ، لاہور سے شائع ہوئیں ہیں۔

غزل میں انھیں میر کا مقلد کہا جاتا ہے اس سلسلے میں وہ اپنی کتاب ''چاند نگر'' کے دیباچے میں میر کی دانستہ تقلید سے انکار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میرے ہندی کے تھوڑے سے مطالع نے بھی مجھے بہت فائدہ
پہنچایا ہے۔ مجھے رواں دواں بحریں زیادہ مرغوب ہیں۔ غزلوں
میں بھی ان کا انتخاب میں نے میر کی بیعت کے خیال سے نہیں
(میرؔ پسندی اور میرؔ سے مزاجی اشتراک اپنی جگہ) بلکہ اپنی
آسانی کے لئے کیا ہے۔ محض تقلید میرؔ منظور ہوتی تو یہ بحریں
میری غزلوں تک محدود رہ جائیں، نظموں میں نہ بار پاتیں۔''

ابن انشاء ۱۵/اپریل ۱۹۵۵ء

بہر حال وہ جدید غزل کے اہم شاعر بھی ہیں۔ ابن انشاء کا ذکر میر کے رنگ

کے اتباع کرنے والے شعراء میں ہوتا ہے۔ ابن انشاء نے اپنے دامن سے جو کلیاں، کانٹے یا غبار اپنے چاہنے والوں کو دئے ان میں نظم گیت اور غزلیں سبھی بہت مقبول ہوئے۔

ابن انشاء کی اکثر غزلیں بڑی شگفتہ اور خوبصورت ہیں وہ غزل گانے والوں میں بھی بہت مرغوب اور محبوب ہیں جس کا سبب یہ بھی ہے کہ ان کی غزلیں سادہ، رواں دواں اور نغمگی سے بھرپور ہیں۔ انشاء کی یہ غزل، غزل کے کئی گلوکاروں نے گائی اور بے حد مشہور و مقبول ہوئی اور ہر گھر میں ہر دل کی آواز بن گئیں۔

کل چودھویں کی رات تھی شب بھر رہا چرچہ ترا
کچھ نے کہا یہ چاند ہے، کچھ نے کہا چہرا ترا
ہم بھی وہیں موجود تھے ہم سے بھی سب پوچھا کئے
ہم ہنس دئے ہم چپ رہے منظور تھا پردہ ترا
اس شہر میں کس سے ملیں ہم سے تو چھوٹی محفلیں
ہر شخص تیرا نام لے ہر شخص دیوانہ ترا
کوچے کو تیرے چھوڑ کر جوگی ہی بن جائیں مگر
جنگل تیرے پربت تیرے بستی تیری صحرا ترا
بے درد سنی ہو تو چل کہتا ہے کیا اچھی غزل
عاشق ترا، رسوا ترا، شاعر ترا، انشاء ترا

یہ غزل بھی بے حد خوبصورت ہے مطلع ملاحظہ کریں:

انشاء جی اٹھو اب کوچ کرو اس شہر میں دل کو لگانا کیا
کیوں سانجھ ڈھلے گھر آئے ہو بجنی سے کروگے بہانا کیا

ابن انشاء کی غزلیں ہندو پاک میں بے حد محبوب اور مقبول ہیں۔ دراصل انشاء کی غزل کا خاص رنگ، دل کی باتیں دل سے کرنے کا ہنر ہے اور اس رنگ میں انہوں نے جو شعر کہے ہیں انھیں عالمگیر مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ اس شعر کا لہجہ دیکھئے:

دل سی چیز کے گاہک ہونگے دو یا ایک ہزار کے بیچ
انشاء جی کیا مال لئے بیٹھے ہو تم بازار کے بیچ

ابن انشاء نے اپنی تازہ کاری سے غزل کو نیا روپ دیا۔ ناصر کاظمی کی طرح ان کی بھی بدنصیبی رہی کہ جلدی انتقال ہوگیا۔ غزل میں ابن انشاء کا سرمایہ کم ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے اس مختصر سی عمر میں غزل کے علاوہ نظمیں، گیت اور ٹی وی کے ڈرامے اور سفرنامے بھی لکھے ہیں۔

ڈاکٹر محمد حسین اپنے مضمون ''کچھ جدید غزل کے بارے میں'' مطبوعہ ''جدید اردو غزل ۱۹۴۰ء کے بعد'' میں لکھتے ہیں:

> ''ابن انشاء کی کوشش اپنی شاعری کو اپنے قارئین کے درمیان ایک مانوس اور بھرے پرے کنبے کی حیثیت سے متعارف کرانے کی تھی اور ان کے پڑھنے والے ان کے محبوب ہی سے نہیں انشاء جی اور ان کے جوگ بروگ سے بھی ایسے قریبی جان پہچان رکھتے ہیں کہ ان کی ہر غزل گویا مانوس لمحوں کی دہلیز معلوم ہوتی ہے۔ یہ کیفیت انوکھی ہے اور شاید ابن انشاء کی غزل تک محدود ہے۔''

(جدید اردو غزل ۱۹۴۰ء کے بعد صفحہ نمبر ۱۱
خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ، اشاعت ۱۹۹۵ء)

ابن انشاء میرؔ سے اظہارِ عقیدت کچھ اس طرح کرتے ہیں:

اک بات کہیں کہ انشاء جی تمھیں ریختہ کہتے عمر ہوئی
تم ایک جہاں کا علم پڑھے کوئی میرؔ سا شعر کہا تم نے

یہاں یہ ذکر ضروری ہے کہ تقسیم کے بعد ہندوستان اور پاکستان میں میرؔ کی بازیافت بڑی تیزی سے ہوئی۔ دھیرے دھیرے پاکستان اور ہندوستان کی غزل میں نمایاں فرق بھی نظر آنے لگا۔ غزل نے مشکل عربی فارسی الفاظ کی جگہ سادہ اور سلیس زبان کو روا رکھا۔ پاکستان میں ابن انشاء اور ناصر کاظمی اس سلسلے میں سرِ فہرست ہیں۔ انشاء کی انفرادیت یہ ہے کہ وہ میرؔ کی غزل کی اداس فضاء سے الگ ہٹ کر ہنستی بولتی عشقیہ شاعری کرتے ہیں۔ ان کے یہاں ہندی کے سادہ الفاظ بڑی خوبصورتی سے استعمال ہوتے ہیں۔ مثلاً

گوری اب تو آپ سمجھ لے ہم ساجن یا دشمن ہیں
گوری تو ہے جسم ہمارا ہم تیرا پیراہن ہیں

☆

نگری نگری گھوم رہے ہیں سکھیو اچھا موقع ہے
روپ سروپ کی بھکشا دے دو ہم اک پھیلا دامن ہیں

☆

لوگوں میلے تن من دھن کی ہم کو سخت مناہی ہے
لوگو، ہم اس چھوت سے بھاگیں ہم تو کھرے برہمن ہیں

☆

پیت کرنا تو ہم سے نبھانا سجن ہم نے پہلے ہی دن تھا کہانا سجن
تم ہی مجبور ہو، ہم ہی مختار ہیں خیر مانا سجن یہ بھی مانا سجن

☆

جلوہ نمائی بے پروائی ہاں یہی ریت جہاں کی ہے
کب کوئی لڑکی من کا دریچہ کھول کے باہر جھانکی ہے

☆

انشاء جی اسے روک کے پوچھیں تم کو مفت ملا ہے حُسن
کس لئے پھر بازار وفا میں تم نے یہ جنس گراں کی ہے

جدید غزل گو شعراء نے اپنی غزل کی بنیاد حقیقت نگاری پر رکھی ہے اور زبان بول چال والی رکھی ۔ ابن انشاء کی غزل میں ہندی اردو کے الفاظ کا بڑا ہی خوب صورت امتزاج ملتا ہے۔

## خلیل الرحمٰن اعظمی

پیدائش: ۹/ اگست ۱۹۲۷ء وفات: ۱۹۷۸ء

خلیل الرحمٰن اعظمی ۹/ اگست ۱۹۲۷ء کو اعظم گڑھ یوپی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم شبلی نیشنل اسکول اعظم گڑھ میں ہوئی۔ خلیل الرحمٰن اعظمی ۱۹۴۵ء میں علی گڑھ تعلیم حاصل کرنے کے لئے آگئے تھے۔ ۱۹۵۱ء میں ایم اے اردو امتیازی حیثیت سے پاس کیا۔ انکی صلاحیتوں اور قابلیت کی وجہ سے مسلم یونیورسٹی گزٹ کے ایڈیٹر رہے۔

۱۹۵۳ء میں علی گڑھ میں شعبہ اردو کے لیکچرر ہو گئے۔ طالب علمی کے زمانے میں علی گڑھ میگزین کے ایڈیٹر رہے اور انجمن اردو معلیٰ کے سکریٹری رہے۔ وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں بحیثیت ریڈر اور پھر پروفیسر ہوئے۔ اپنے شاگردوں میں بہت مقبول استاد مانے جاتے تھے لیکن عہد جوانی میں ان کا انتقال ہوگیا۔ ان کی پی ایچ ڈی کی تھیسیز کتابی صورت میں ''ترقی پسند ادبی تحریک'' کے عنوان سے ''انجمن ترقی اردو، ہند'' نے شائع کی ہے۔ وہ شعبہ اردو کے بہت اہم استاد مانے جاتے تھے۔ ان کا ایک اور وصف یہ تھا کہ وہ قدیم شعر و ادب کے بہت اچھے استاد تھے۔ ترقی پسند ادب پر ان کی گہری نظر تھی۔ جدید غزل اور نظم پر ان کی تنقیدی نظر تھی۔ اُن کی تنقیدی رائے بھی بہت مستند مانی جاتی ہے۔ عہدِ جدید کے شعراء و ادباء میں انھیں اہم مقام حاصل تھا۔

ناصر کاظمی کی طرح یہ بھی میرؔ سے تخلیقی طور پر متاثر تھے جس کے متعلق وہ اپنی کتاب ''نیا عہد نامہ'' کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

> ''کلیات میر کے مطالعہ کے دوران مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میری داخلی دنیا میں کچھ دریچے کھل گئے ہیں۔''

(صفحہ نمبر ۱۵ نیا عہد نامہ)

لیکن رفتہ رفتہ انہوں نے جدید غزل میں اپنی نئی فکر سے مرکزی جگہ بنالی تھی۔ ان کی غزل قدیم اور جدید غزل کے تخلیقی امتزاج کا اعلیٰ نمونہ ہے۔

خلیل الرحمٰن اعظمی نے جب محبت کی کیفیت کو محسوس کیا اس احساس کو انہوں نے اپنی کتاب ''نیا عہد نامہ'' جو ۱۹۶۵ء میں جمال پرنٹنگ پریس، دہلی سے شائع ہوئی، میں بڑی سادگی کے ساتھ لکھا ہے:

''غالباً ۱۹۴۶ء کی بات ہے میں انٹر میڈیٹ کا طالب علم تھا۔
ایک دن اچانک میں نے اپنے دل میں اچانک ایسی خلش محسوس
کی جس کا سبب مجھے خود نہیں معلوم تھا۔ میں نے محسوس کیا جیسے
مجھے کسی سے محبت ہوگئی ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ محبوبہ کا کوئی
وجود نہیں تھا۔''

خلیل الرحمٰن اعظمی غزل کے ساتھ نظم کے بھی اہم شاعر تھے۔ اس کے علاوہ وہ جدید اردو شعر و ادب کے ناقدین میں سرِ فہرست ہیں۔ ان کے شعری مجموعوں اور تنقیدی کتابوں کی تفصیل اس طرح ہے:

(۱) کاغذی پیرہن: پہلا مجموعہ کلام (۱۹۵۵ء)
(۲) فکروفن (تنقیدی مضامین ۱۹۵۶ء)
(۳) نوائے ظفر (بہادر شاہ ظفر کے کلام کا تنقیدی مطالعہ اور انتخاب ۱۹۵۷ء)
(۴) مقدمہ کلام آتش ۱۹۵۸ء
(۵) نیا عہد نامہ (دوسرا مجموعہ کلام ۱۹۶۵ء)
(۶) زاویۂ نگاہ (تنقیدی مضامین ۱۹۶۶ء)
(۷) ترقی پسند ادبی تحریک۔

ان کے کچھ شعر پیش کئے جا رہے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ غزل کے نمائندہ شاعر ہیں۔ فنی پختگی سادگی بیان جدیدیت اور تازگی ان کی غزلوں کا خاص وصف ہے۔

وہ دن کب کے بیت گئے جب دل سپنوں سے بہلتا تھا
گھر میں کوئی آئے کہ نہ آئے ایک دیا سا جلتا تھا
شاید اپنا پیار ہی جھوٹا تھا ورنہ دستور یہ تھا
مٹی میں جو بیج بھی بویا جاتا تھا وہ پھلتا تھا

☆

وادیٔ غم میں مجھے دیر تک آواز نہ دے
وادیٔ غم کے سوا میرے پتے اور بھی ہیں

(۱۹۵۶ء)

آج آئینہ جو دیکھا تو ہوا یہ محسوس
جانے یہ کون ہے؟ میں ایسا تھا؟ یہ میں تو نہیں!!

(۱۹۵۶ء)

☆

وہ رَت جگے رہے نہ وہ نیندوں کے قافلے
وہ شام میکدہ وہ شب مُشک بو گئی
جلتا نہیں اب کوئی دیا دل کے نگر میں
ویران ہے اک ایک گلی دیکھئے کیا ہو

(۱۹۵۹ء)

☆

کہے گا دل تو میں پتھر کے پاؤں چوموں گا
زمانہ لاکھ کرے آکے سنگ سار مجھے

☆

زنجیر آنسوؤں کی کہاں ٹوٹ کر گری
وہ انتہائے غم کا سکوں کون لے گیا

☆

میں دیر سے دھوپ میں کھڑا
سایا سایا پکارتا ہوں

(۱۹۶۴ء)

غزل میں سوگوار لہجہ اور خود کلامی کا انداز بھی خلیل الرحمٰن اعظمی کے یہاں پایا جاتا ہے۔ انہوں نے عصری آگہی کا اظہار نہایت پُرسوز اور پُر خلوص انداز میں کیا ہے۔ ان کا لہجہ روح میں اندر تک اُتر جانے کی صلاحیت رکھتا ہے اور دوسرے اہم شعراء کی طرح خلیل الرحمٰن اعظمی بھی میرؔ سے متاثر نظر آتے ہیں:

تم نے بھلا دیا تو نئی بات کیا ہوئی
رہتی ہیں یاد کس کو وفا کی کہانیاں

☆

کرتے ہیں یاد اب تک بیتی ہوئی بہاریں
آنکھوں سے چومتے ہیں اک ایک پنکھڑی کو

(تلاش ۱۹۶۹ء)

☆

گردِ ملال کب سے پلکوں پہ جم رہی تھی
جی بھر کے رولئے تو آنکھوں میں روشنی ہے

☆

ہجر تو ہجر تھا اب دیکھئے کیا بیتے گی
اس کی قربت میں کئی درد نئے اور بھی ہیں
رات تو خیر کسی طرح سے کٹ جائے گی
رات کے بعد کئی کوس کڑے اور بھی ہیں

☆

تیری سدا کا ہے صدیوں سے انتظار مجھے
مرے لہو کے سمندر ذرا پکار مجھے

خلیل الرحمٰن اعظمی کی غزل گوئی پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر آل احمد سرور فرماتے ہیں:

"اعظمی کی اپنی آواز ہے۔ اپنا لب ولہجہ اور اپنا آہنگ۔ یوں ان کے یہاں میرؔ کی سی نشتریت بھی محسوس ہوتی ہے مگر اس دور کے مسائل اور معاملات کے شعور نے اس نشتریت میں ایک نئی نوک پیدا کر دی ہے۔ آزادی کے بعد اردو کے جن شاعروں کے کلام نے اہل نظر کو اپنی طرف متوجہ کیا ہے ان میں اعظمی ایک امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی غزل اپنے لطیف اشاروں کی بلاغت کی وجہ سے اس دور کے سوز وساز کی کتنی ہی داستانیں اپنے اندر سموئے ہوئے ہیں۔"

(نیا عہد نامہ۔ صفحہ کور پیج فلیپ)

خلیل الرحمٰن اعظمی کی شاعری کا آغاز ترقی پسند رجحانات سے ہوا تھا، لیکن جلد

ہی انھیں یہ احساس ہوگیا کہ ترقی پسندی سے غزل ایک نعرہ بن کر رہ جاتی ہے۔ اس بات کو محسوس کر کے انہوں نے اپنی غزل کو حیات و کائنات سے وابستہ کیا۔ اسی وجہ سے ان کے یہاں نیا لب ولہجہ ملتا ہے۔ ان کا مطالعہ بیحد وسیع تھا۔ ان کے اکثر اشعار میں زندگی کی آگہی اور اس کا کرب واضح طور پر نظر آتا ہے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی کی غزل بجا طور پر عہدِ جدید کی غزل کہلانے کی مستحق ہے۔

## شاد عارفی

پیدائش ۱۹۰۳ء وفات ۱۹۶۴ء

شاد عارفی رام پور کے رہنے والے تھے۔ ان کی پیدائش ۱۹۰۳ء میں لوہارو (پنجاب) میں ہوئی تھی۔ شاد عارفی کا اصلی نام احمد علی خاں تھا۔ ان کے والدین انھیں پیار سے لڈن خاں کہتے تھے۔ یہ نام ان کی عرفیت تھی۔ شاد عارفی نے اپنی شاعری کا آغاز غزل گوئی سے کیا اور اپنا تخلص اپنے والد کے نام سے نکالا۔ ان کے والد کا نام عارف اللہ خاں تھا اور والدہ رشیدہ بیگم تھیں۔ شاد عارفی کی تعلیم اور تربیت اسکول اور گھر میں ہوئی۔ اسکول میں میٹرک تک پڑھا لیکن عربی فارسی کی تعلیم پختہ طور پر حاصل کی۔ ان زبانوں میں ان کو کمال حاصل تھا۔ انہوں نے لمبے عرصے تک شاعری کی۔ ۱۹۳۹ء میں ان کی شادی ہوئی۔ ان کی بیگم کا نام پری بیگم تھا۔ انہوں نے کئی چھوٹی چھوٹی ملازمتیں کیں۔

شاد عارفی بڑے قادر الکلام شاعر تھے وہ اردو کے اہم رسائل مثلاً نقوش لاہور، سویرا لاہور، نیا دور کراچی اور شاعر ممبئی میں بڑی شان سے چھپتے تھے۔ ان کا شمار صفِ اوّل کے اردو غزل گو شعراء میں ہوتا تھا۔ ان کی انفرادیت یہ ہے کہ وہ انسان اور زندگی کا حسن ہی نہیں دیکھتے تھے بلکہ جن لوگوں نے زندگی کو بدصورت اور بدکار بنا دیا ہے

اس پر بھر پور حملہ کرتے ہیں۔

وہاں ہماری آہ زیرلب پہ اعتراض ہے
جہاں عدوے بے ادب دھواں اگلتے آئے ہیں

(آزادی کے بعد اردو غزل۔صفحہ ۱۷۵، بشیر بدر)

کھری باتیں بہ اندازِ سخن کہہ دوں تو کیا ہوگا
عدوئے جان وتن کو جان من کہدوں تو کیا ہوگا
نگہبانِ وطن کو راہ زن کہدوں تو کیا ہوگا
کسی بھی بدچلن کو بدچلن کہدوں تو کیا ہوگا

شاعر کا یہ رویہ کے جن لوگوں نے حسن وعشق کو اور محبت کے پاکیزہ جذبات کو بازاری بنایا ہے ان پر اعتراض کرتا ہے اور اعلیٰ تہذیبی اقدار کی بڑی عزّت بھی کرتا ہے اور وہ ان لوگوں پر بھر پور وار کرتے ہیں جو معصومیت، محبت اور شرافت کے دشمن ہیں:

بد مزاجی کو معتبر نہ بناؤ
بزم سے ہم کو مسکرا کے اٹھاؤ
عہدِ حاضر کی روشنی پہ نہ جاؤ
جب ستارے بجھیں چراغ جلاؤ

حقیقت پسندی کے اثر سے سیاسی موضوعات کے علاوہ غزل کے عشقیہ تصور میں بھی فرق آیا وہ عام سماجی مسائل کو بھی بڑی خوبی سے غزل کے سانچے میں ڈھالتے ہیں۔ کہیں کہیں شاد عارفی بڑے تیکھے انداز میں ان موضوعات کو پیش کرتے ہیں۔ تلخی، بیبا کی اور طنز کے نشتر شاد عارفی کی غزل میں صاف نظر آتے ہیں۔ مثلاً

اُداسیوں کی چھاؤں کو سمجھ رہے ہیں نور ہے
یہ آپ کی تمیز ہے یہ آپ کا شعور ہے

☆

مگر یہاں تو جل رہا ہے آدمی سے آدمی
سنا یہ تھا چراغ سے چراغ جلتے آئے ہیں

☆

ٹھوکر پہ مارتا ہوں حقارت کی پیشکش
تو مفت کی شراب ہی مجھ کو پلا کے دیکھ
اخفائے راز ربط تعلق کے واسطے
محفل میں تو سبھی کی طرف مسکرا کے دیکھ

شاد عارفی کے مندرجہ بالا اشعار ایک شاعر کی حق گوئی اور شاعرانہ انفرادیت کا پتہ دیتے ہیں۔ شاد عارفی اکثر اشعار غزل کے ترنم، آہنگ اور اس کے رمزیت ایمائیت سے ہٹ کر تلخ اور تیکھے لہجے میں کہتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں اکثر کٹیلا طنز پایا جاتا ہے۔

جب چلی اپنوں کی گردن پر چلی
چوم لوں منہ آپکی تلوار کا

☆

چند بڑے لوگوں سے مل کر میں نے یہ محسوس کیا ہے
اپنی بابت نا اہلوں کو کیا دلچسپ گماں ہوتے ہیں

☆

غلط باتوں پہ دنیا کب توجہ صرف کرتی ہے

بتوں کو بے زباں و بے ذہن کہدوں تو کیا ہوگا

☆

سینک سکتے ہیں آپ بھی آنکھیں

آشیانوں کے جل رہے ہیں الاؤ

شاد عارفی کی شعری صلاحیتوں پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر حنیف فوق اپنے مضمون ''اردو غزل کے نئے زاویے'' مطبوعہ فنون لاہور میں لکھتے ہیں:

''شاد نے خوب ناخوب کا جائزہ لیتے ہوئے شوخی اور ظرافت اور طنز و استہزا کے پھول کھلائے ہیں۔ شاد عارفی میں بڑی جرأت اور بے باکی ہے اگرچہ وہ منظّم فکر کے شاعر نہیں ہیں لیکن شاعری کا فکری میلان، سماجی تضادات کو پیش کرنے کی حد تک ان کی غزل میں ضرور رنگ دکھلاتا ہے۔''

(فنون لاہور ۱۹۶۹ء صفحہ ۱۱۶۰)

شاد عارفی کے یہاں جو جذباتی اضطراب ملتا ہے وہ زندگی کے بدلتے ہوئے حالات کی غمازی بھی کرتا ہے اور ان کا طرزِ بیان بے خوف اور نڈر ہے، چند شعر ملاحظہ کیجیے:

زمانہ ساز کو ہونٹوں میں کیوں برا کہدوں

مرا مزاج تو یہ ہے کہ برملا کہدوں

یہ سوچتا ہوں کہ تھوڑی سی آج پی کر شاؔد

رموزِ خلوتِ یارانِ اتقا کہدوں

☆

بیان کر رہا ہوں اس کے منہ پہ اس کی خامیاں

برس پڑے جو منہ پہ بزم دوست، بے قصور ہے

اگر میں اٹھ چلوں، کہیں گے مے کا اہل ہی نہ تھا

اگر میں جام توڑدوں کہیں گے بے شعور ہے

بے کسی میں سابقہ پڑنے سے اندازہ ہوا

آپ کو میں دوست سمجھا تھا، بڑا دھوکا ہوا

شاد عارفی نے زندگی میں بہت سی دشواریوں اور غموں کا سامنا کیا۔ جب وہ چالیس سال کے تھے تب ان کی شادی ہوئی اور ڈیڑھ سال کے بعد ہی ان کی بیوی کا انتقال ہوگیا۔ رشتہ داروں نے ان کا ساتھ نہیں دیا۔اس غم نے ان کی صحت خراب کر دی۔ مزاج کے اعتبار سے بہت خوددار تھے اس لئے کسی کی مدد لینا اپنی بے عزّتی سمجھتے تھے۔انہیں پریشانیوں کی وجہ سے ان کی شاعری میں طنز پیدا ہوا۔ زندگی کے کئی سال مفلسی اور بے روزگاری میں گزارنے کی وجہ سے بھی شاعری میں تلخی نظر آتی ہے:

میں پڑوسی ہوں بڑے دیندار کا

کیا بگڑتا ہے مگر مے خوار کا

مجھ سے رتبہ ہے میرے اشعار کا

باڑھ کاٹے، نام ہو تلوار کا
سوگئی ہو جیسے گھوڑے بیچ کر
ہے وہ عالم ''قسمتِ بیدار'' کا

☆

دل میں لہو کہاں تھا کہ اک تیر آلگا
فاقے سے تھا غریب کہ مہمان آگیا

☆

میں دنیا پر طنز کروں گا
دنیا میرے کیوں در پے ہو

شاد عارفی نے کئی نظمیں بھی لکھیں ۔ ان میں بھی غزل کی طرح تنک مزاجی اور جارحانہ پن نظر آتا ہے۔ ان کی نثر اور تنقید بھی بڑی دھار دار اور بے ساختہ ہوتی تھی۔

شاد عارفی کا مجموعہ ۱۹۴۶ء میں ''سماج'' کے نام سے چھپا تھا۔ اس کے علاوہ ان کے مطبوعات کے نام ہیں۔

(۱) انتخاب شاد عارفی۔ انجمن ترقی اردو
(۲) شاد۔ عابد رضا بیدار کا مرتب کردہ کتابچہ
(۳) سفینہ چاہیے۔ مرتبہ سلطان اشرف
(۴) نثر و غزل دستہ۔ مرتبہ مظفر حنفی
(۵) شاد عارفی کی غزلیں۔ مرتبہ مظفر حنفی

(۶)　کلیات۔ شاد عارفی مرتبہ مظفر حنفی

(۷)　دکھتی رگیں۔ مرتبہ سلطان اشرف

(۸)　سماج۔ شاد عارفی طباعت رشید خاں مخمور ۱۹۴۶ء

تقریباً پچاس سال تک شعر و شاعری نظم و نثر تنقید لکھنے کے بعد ۸ر فروری ۱۹۶۴ء کو رام پور میں ان کا انتقال ہوگیا۔

ڈاکٹر مظفر حنفی نے ان پر تحقیقی مقالہ لکھ کر برکت اللہ یونیورسٹی سے پی. ایچ. ڈی. کی ڈگری حاصل کی۔

## منیر نیازی

پیدائش: ۱۹۳۲ء　　　وفات: ۲۰۰۶ء

پاکستان کے غزل گوشعراء میں ایک اہم نام منیر نیازی کا بھی ہے۔ ان کے یہاں نا تو ناصر کاظمی کی اُداس فضاء ہے نا ابن انشاء کی گیت نما غزل کا شگفتہ آہنگ ہے بلکہ ان کی انفرادیت ان کی محاکات نگاری ہے۔ غزل کے دو مصرعوں میں بھرپور کہانی کہہ دیتے ہیں۔

منیر نیازی اور ان کے دیگر ہم عصر شعراء کے متعلق دلکش ساگری اپنی مرتب کی ہوئی کتاب ''بھوپال میں غزل'' صفحہ نمبر ۱۴ پر لکھتے ہیں:

''فراق، ناصر کاظمی، مجید امجد، ظفر اقبال، شکیب جلالی، منیر نیازی، بشیر بدر، شہریار، احمد فراز وغیرہ اور نئی نسل کے دوسرے

بہت سے شاعروں کی غزل میں خیال اور موضوع کی نیم پختگی یا
حد سے گزری ہوئی پیچیدگی سے ضرور اختلاف کیا جا سکتا ہے،
لیکن ان لوگوں کے ہاتھوں جس بے ساختہ طرحدار اور دل موہ
لینے والے لہجے اور اسلوب کی داغ بیل پڑی ہے اس سے انکار
نہیں کیا جا سکتا۔"

منؔیر نیازی دو مصروں میں بھرپور مناظر قید کردیتے ہیں۔ ان کے انداز میں
انفرادیت ہے۔ غزل کے لطیف پیرائے میں افکارِ تازہ ملاحظہ کیجئے۔

ایک چیل ایک ممٹی پہ بیٹھی ہے دھوپ میں
گلیاں اجڑ گئی ہیں مگر پاسباں تو ہے

☆

نیند کا ہلکا گلابی سا خمار آنکھوں میں تھا
یوں لگا جیسے وہ شب کو دیر تک سویا نہیں

☆

اپنی ہی تیغ ادا سے آپ گھایل ہوگیا
چاند نے پانی میں دیکھا اور پاگل ہوگیا

☆

میں اکیلا اور سفر کی شام رنگوں میں ڈھلی
پھر یہ منظر میری نظروں سے بھی اوجھل ہوگیا

☆

نواحِ قریہ ہے سنسان شامِ سرما ہے
کسی قدیم زمانے کی سرزمیں کی طرح

☆

جنگلوں میں کوئی پیچھے سے بلائے تو منیؔر
مڑ کے رستے میں کبھی اس کی طرف مت دیکھنا

☆

وہ ہوا تھی شام ہی سے رستے خالی ہو گئے
وہ گھٹا برسی کہ سارا شہر جل تھل ہو گیا

منیؔر نیازی کی غزلیں ان لوگوں کے لئے مثالی ہیں جو غزل کے دو مصرعوں میں تنگی کا شکوہ کرتے ہیں کہ ان کی یہ ہنر مندی قابلِ داد ہے۔ ان کی غزل کا آہنگ منفرد ہے جو ذہن و دل کو نئے نئے احساس سے روشناس کراتا ہے۔ وہ دو مصرعوں میں بھرپور گفتگو کرنے کا فن بھی جانتے ہیں۔

بے چین بہت پھرنا گھبرائے ہوئے رہنا
اک آگ سی جذبوں میں دہکائے ہوئے رہنا
عادت ہی بنا لی ہے ہم نے تو منیؔر اپنی
جس شہر میں بھی رہنا اکتائے ہوئے رہنا

☆

گھٹا دیکھ کر خوش ہوئیں لڑکیاں
چھتوں پر کھلے پھول برسات کے

☆

جانتا ہوں ایک ایسے شخص کو میں بھی منیرؔ

غم سے پتھر ہوگیا لیکن کبھی رویا نہیں

منیرؔ نیازی بنیادی طور پر جدید نظم کا اہم ترین نام ہے مگر ان کی غزلوں میں جو انوکھاپن، اسلوب اور فکر میں جو تازگی ہے وہ لاجواب ہے۔ منیرؔ نیازی نے غزلیں نظم کے مقابلے کم لکھی ہیں مگر جو بھی غزلیں لکھی ہیں وہ شہکار ہیں۔ ان کے اشعار اپنی تازگی اور اپنے اسلوب کی وجہ سے بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔

منیرؔ نیازی کی غزلوں کی زبان سادہ اور عام فہم ہے۔ ان کی غزلوں میں تازہ فضاء ملتی ہے۔ ان کی فکر اور اسلوب دونوں منفرد ہیں۔ منیرؔ کی غزل میں عصری حسیت بھی نظر آتی ہے۔ فکر وفن کی تازگی کے ساتھ ان کی غزل آج کے دور کی غزل کے مزاج سے ہم آہنگ ہے۔ منیرؔ نیازی کی ایک خوبصورت غزل سہ ماہی رسالے ''جمنا تٹ'' (جولائی تا ستمبر ۲۰۰۵ء) میں چھپی ہے جو ''بخط شاعر'' ہے۔ اس غزل کے چند شعر ملاحظہ ہوں:۔۔۔

رنج فراق یار میں رسوا نہیں ہوا

اتنا میں چپ ہوا کہ تماشا نہیں ہوا

ایسا سفر ہے جس میں کوئی ہمسفر نہیں

رستہ ہے اس طرح کا کہ دیکھا نہیں ہوا

مشکل ہوا ہے رہنا ہمیں اس دیار میں

برسوں یہاں رہے ہیں پر اپنا نہیں ہوا

منیرؔ نیازی کا مجموعہ ''جنگل میں دھنک'' ہے جو ۱۹۶۰ء میں نزیر احمد چودھری

نے نیا ادارہ سویرا آرٹ پریس لاہور سے شائع کیا تھا۔

منؔیر نیازی کے یہاں ''ہوا'' کا استعارہ بہت اہمیت رکھتا ہے لیکن فکر میں کسی قدر یک رنگی ہے پھر بھی منؔیر نیازی نے جو غزلیں کہیں ان میں شائستگی و جمالیاتی حسن موجود ہے۔ ان کے مزاج نے عشقیہ شاعری کو خوبصورت انداز دیئے۔ ''گھٹا دیکھ کر خوش ہوئیں لڑکیاں'' یہ مصرعہ بہت سہل اور سادہ زبان میں ہے۔ ''چھتوں پر کھلے پھول برسات کے'' اس دوسرے مصرعے نے منظر کو اور حسین بنا دیا۔ منؔیر نیازی کے چند شعر ملاحظہ ہوں:—

ہوا تھی، گہری گھٹا تھی، حنا کی خوشبو تھی
یہ ایک رات کا قصہ لہو رُلا بھی گیا

☆

شام ہے گہری تیز ہوا ہے سر پہ کھڑی ہے رات
رستہ گئے مسافر کا اب، دیا جلا کر دیکھ

☆

میں ایک ماہِ جنوں خیز کی ضیاء کے سوا
نگر میں کچھ نہیں باقی رہا ہوا کے سوا

## احمد فراز

پیدائش: ۱۹۳۱ء　　　وفات: ۲۰۰۸ء

احمد فراز ۱۴؍ جنوری ۱۹۳۱ء کو شہر کوہاٹ (پاکستان) میں پیدا ہوئے۔ اسلامیہ ہائی اسکول کوہاٹ سے ہائی اسکول کیا۔ پشاور کے ایڈورڈ کالج سے بی.اے.

کرنے کے بعد پشاور یونیورسٹی سے اردو اور فارسی میں ایم.اے. کیا۔ اسلامیہ کالج پشاور میں اردو کے لیکچرر رہے۔ ریڈیو میں اسکرپٹ رائٹر کے طور پر بھی کام کیا۔ پاکستان کی کئی ادبی اکیڈمیوں سے بھی وابستہ رہے۔

غزل اور نظم دونوں پر قدرت رکھتے تھے۔ وہ بلاشبہ ادب اور ادبی محفلوں میں بہت مقبول رہے۔ ان کی پہلی کتاب ''تنہا تنہا'' (شعری مجموعہ) ہے۔ جس پر تبصرہ کرتے ہوئے فیض احمد فیض نے لکھا ہے:

''ان کے کلام میں خیال اور جذبہ کا قالب اور شعر کا لباس الگ الگ دکھائی نہیں دیتے، آپس میں پیوست ہیں۔''

(فن اور شخصیت۔ مقبول شعراء نمبر مدیران صابر دت، ظہیر علی ساحر پبلیکیشن ہاؤس پرچھائیاں ممبئی)

احمد فراز کا دوسرا مجموعہ ''درد آشوب'' کے نام سے چھپا جس پر ۱۹۷۴ء میں پاکستان میں آدم جی ایوارڈ ملا۔

احمد فراز کو شاعری اپنے والد آغا محمد شاہ برق کوہاٹی کی طرف سے ورثے میں ملی تھی۔ احمد فراز نے اردو کے ساتھ فارسی میں بھی شعر کہنے کی اپنے والد سے تربیت حاصل کی کیوں کہ ان کے والد فارسی اور اردو میں شاعری کرتے تھے۔ انہیں کالج کے زمانے میں فیض اور سردار جعفری جیسے ترقی پسند شاعر اچھے لگتے تھے۔

انور سدید، لاہور (پاکستان کا مضمون'' کچھ احمد فراز کے بارے میں'' ہفت روزہ ''ہماری زبان'' کے احمد فراز نمبر میں شائع ہوا اس میں وہ ان کے متعلق لکھتے ہیں:-

''احمد فراز کا شمار اردو کے مقبول ترین شاعروں میں ہوتا تھا وہ

ترقی پسند تحریک میں سلسلۂ فیض احمد فیض کے شاعر تھے۔ طویل
عرصے تک انہوں نے فیض کی تقلید کی اور ایسی شاعری کو ترجیح دی
جو شباب کی پہلی کرن دیکھنے والے لڑکوں اور لڑکیوں میں قبولیت
حاصل کر سکے۔"

(ہفت روزہ "ہماری زبان" انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی
۲۲ رنومبر تا ۲۱ دسمبر ۲۰۰۸ء)

احمد فراز کی شخصیت اور شاعری کے متعلق رگھوپتی سہائے فراقؔ گورکھپوری کا
خیال ہے:

"احمد فراز کی شاعری اردو میں ایک نئی اور انفرادی آواز کی
حیثیت رکھتی ہے ان کے وجدان کی اور جمالیاتی شعور کی ایک
خاص شخصیت ہے جو نہایت دلکش خدوخال سے مزین ہے۔ ان
کے سوچنے کا انداز نہایت حساس اور پُر خلوص ہے۔"

(فراق گورکھپوری۔ فن و شخصیت۔ مقبول شعراء نمبر۔
مدیران۔ صابر دت ظہیر علی)

فراق صاحب کی رائے کی روشنی میں فرازؔ کے انفرادی لہجے سے آراستہ چند شعر ملاحظہ
ہوں۔

تو خدا ہے نہ میرا عشق فرشتوں جیسا
دونوں انسان ہیں تو کیوں اتنے حجابوں میں ملیں

☆

رنجش ہی سہی دل کو دکھانے کے لئے آ
آ پھر سے مجھے چھوڑ کے جانے کے لئے آ
کس کس کو بتائیں گے جدائی کا سبب ہم
تو مجھ سے خفا ہے تو زمانے کے لئے آ

احمد ندیم قاسمی نے بھی ان کے فکر وفن کو اس طرح سراہا ہے:

''احمد فراز برائے حیات کے ترجمان ہیں مگر انہوں نے اس حقیقت کو کبھی فراموش نہیں کیا کہ وہ اول و آخر فنکار ہیں ............... اور غزلوں میں ان کے فنکارانہ احساسِ ذمہ داری کا اظہار بدرجہ اتم موجود ہے۔''

(فن وشخصیت۔ مقبول شعراء نمبر مدیران صابر دت اور ظہیر علی ساحر پبلشنگ ہاؤس ممبئی۔ اشاعت مئی ۱۹۹۱ء)

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ایم.اے. اردو کے نصاب میں بھی احمد فراز کا کلام شامل تھا۔ بلاشبہ احمد فراز ہندوستان اور پاکستان کے نوجوان شاعروں میں اس لحاظ سے بھی منفرد ہیں کہ رسالوں اور کتابوں کے وسیلے سے بھی پسند کئے جاتے ہیں اور ہندوستان پاکستان کا کوئی عالمی مشاعرہ جن چند شاعروں کے بغیر مکمل نہیں ہوتا ان میں ایک اہم نام احمد فراز کا بھی ہے۔ ان کی غزل پر عصر حاضر کے تقریباً تمام اہم ناقدین نے تبصرہ کیا ہے اور انھیں غزل کا صاحب طرز اور ماہر فن شاعر تسلیم کیا ہے۔ ان کا درج ذیل شعر:

اب کے ہم بچھڑے تو شاید کبھی خوابوں میں ملیں
جس طرح سوکھے ہوئے پھول کتابوں میں ملیں

اور بشیر بدر کا یہ شعر:

اُجالے اپنی یادوں کے ہمارے ساتھ رہنے دو
نہ جانے کس گلی میں زندگی کی شام ہو جائے

تقریباً تمام ہی ناقدین نے نمایاں طور پر تحریر کیا ہے۔ احمد فراز کا بچپن اور جوانی اس علاقے میں گزرا ہے جہاں کی اردو اور پنجابی دونوں پر فارسی اور عربی کا بہت اثر ہے۔ اسی لئے وہ اپنے اشعار میں ان زبانوں کا استعمال بڑی چابکدستی سے کرتے ہیں۔ مثلاً

مگر وہ زود فراموش زود رنج بھی ہے
کہ روٹھ جائے اگر یاد کچھ دلاؤں اسے

☆

رہزن ہو تو حاضر ہے متاعِ دل و جاں بھی
رہبر ہو تو منزل کا پتہ کیوں نہیں دیتے

آج کی رومانی غزل کی شناخت یہ ہے کہ اس میں آج کی ہی بولی جانے والی زبان ملتی ہے اور غزل کے دونوں کردار یعنی عاشق ہو یا محبوب اس کی فکر اور اس کی گفتگو میں ہمارے عہد کی شناخت ضرور ہوتی ہے۔ احمد فراز کے یہ کامیاب اشعار ہندوستان اور پاکستان میں یکساں مقبول ہیں:

کروں نہ یاد مگر کس طرح بھلاؤں اسے
غزل بہانہ کروں اور گنگناؤں اسے

☆

خاموش ہو کیوں، داد جفا کیوں نہیں دیتے
بسمل ہو تو قاتل کو دعا کیوں نہیں دیتے

☆

رات کیا سوئے کہ باقی عمر کی نیند اُڑ گئی
خواب کیا دیکھا کہ دھڑکا لگ گیا تعبیر کا

احمد فراز کی ایک طویل غزل میں ''سنا ہے'' کے فقرے سے پندرہ شعر شروع ہوتے ہیں۔ یہ اشارہ یہاں اس لئے کیا کیوں کہ ہندوستان کے اس عہد کے مشہور شاعر خلیل الرحمٰن اعظمی، ندا فاضلی، بشیر بدر، شہریار، جاوید اختر وغیرہ کی غزل کا مطالعہ کریں تو ایسا لگتا ہے یہ لوگ ایک شعر میں پوری کہانی کہہ جاتے ہیں، برخلاف اس کے احمد فراز ہی نہیں بلکہ پاکستان کے بہت سے شعراء کی غزلوں میں غزلِ مسلسل کا انداز نظر آتا ہے۔ ہندوستان میں یہ اسلوب زمانۂ قدیم سے چلا آرہا ہے لیکن بہت زیادہ عام نہیں ہے۔ ہندوستانی اور پاکستانی غزل میں یہ فرق کہیں کہیں نظر آتا ہے کہ ہندوستانی غزل کے اکثر شعراء کا شعر ایک مکمل تجربہ ہوتا ہے اور وہ بولی جانے والی عام زبان میں ہوتا ہے لیکن پاکستان میں جو علاقائی زبانیں بولی جاتی ہیں مثلاً پنجابی، سندھی وغیرہ ان میں بہت سے الفاظ اس لئے عام ہیں کیوں کہ وہ ان کی بول چال کا حصہ ہیں جبکہ ہندوستان میں اردو اور ہندی زبان انگریزی زبان کے بہت سے لفظوں اور لہجے کے قریب ہوتی جارہی ہے اور پاکستان کے بہت سے شہرا بھی ایسے ہیں جہاں انگریزی سے زیادہ عربی اور فارسی کا اثر ہے یا اُن کی مقامی بولیوں کا اثر ہے۔

احمد فراز کی غزل جس میں ''سنا ہے'' سے شروع ہونے والے اشعار میں ایک ربط ہے اور سما باندھنے والی کیفیت بھی پائی جاتی ہے ملاحظہ کیجئے:

سنا ہے لوگ اسے آنکھ بھر کے دیکھتے ہیں
سو اس کے شہر میں کچھ دن ٹھہر کے دیکھتے ہیں
سنا ہے ربط اسے ہے خراب حالوں سے
سو اپنے آپ کو برباد کر کے دیکھتے ہیں
سنا ہے درد کی گاہک ہے چشم ناز اس کی
سو ہم بھی اس کی گلی سے گزر کے دیکھتے ہیں
سنا ہے اس کو بھی ہے شعر و شاعری سے شغف
سو ہم بھی معجزے اپنے ہنر کے دیکھتے ہیں
سنا ہے بولے تو باتوں سے پھول جھڑتے ہیں
یہ بات ہے تو کبھی بات کر کے دیکھتے ہیں
سنا ہے رات اسے چاند تکتا رہتا ہے
ستارے بامِ فلک سے اتر کر دیکھتے ہیں
سنا ہے دن کو اسے تتلیاں ستاتی ہیں
سنا ہے رات کو جگنو گزر کے دیکھتے ہیں
سنا ہے حشر ہیں اس کی غزال سی آنکھیں
سنا ہے اس کو ہرن دشت بھر کے دیکھتے ہیں
سنا ہے رات سے بڑھ کر ہیں کاکلیں اُس کی
اُفق سے شام کے سائے اُتر کے دیکھتے ہیں
سنا ہے اس کی سیہ چشمگی قیامت ہے

سو اس کو سرمہ فروش آہ بھر کے دیکھتے ہیں

سنا ہے آئینہ تمثال ہے، جبیں اس کی

جو سادہ دل ہیں اسے بن سنور کے دیکھتے ہیں

سنا ہے جب سے حمائل ہیں اس کی گردن میں

مزاج اور ہی لعل و گہر کے دیکھتے ہیں

سنا ہے چشم تصور سے دشت امکاں میں

پلنگ زاویے اس کی کمر کے دیکھتے ہیں

سنا ہے اس کے بدن کی تراش ایسی ہے

کہ پھول اپنی قبائیں کتر کے دیکھتے ہیں

سنا ہے اس کے شبستاں سے متصل ہے بہشت

مکیں اُدھر کے بھی جلوے اِدھر کے دیکھتے ہیں

احمد فراز کا یہ انداز بھی اپنے آپ میں ایک کامیاب انداز ہے۔غالبؔ، حسرت، مومن، فراق جیسے شعراء کے یہاں بھی ایک ہی موڈ کی مسلسل غزلیں ملتی ہیں اور اگر ایک موضوع یا ایک کیفیت کو ایک بار شعر میں ڈھالنے کے بعد دوبارہ اس پر طبع آزمائی کی گنجائش نہ ہوتی تو غزل کے روائتی موضوعات کبھی کے ختم ہو چکے ہوتے۔حسن، عشق، تصوف، رندی سرمستی، جیسے موضوعات کو ہر شاعر نے اپنے طور پر بار بار شعر میں پیش کیا ہے۔

اس طویل مثال سے ایک اشارہ ضرور ملتا ہے کہ جب غزل انسانی بول چال کی زبان میں لکھی جائے گی تو وہ اختصار کا معجزہ ہوگی اور یہ معجزہ کسی خاص فرقے کے لئے

نہیں بلکہ لاکھوں اور کروڑوں انسانوں کا حصہ بن جاتا ہے اور ایک موضوع کو طویل مسلسل غزل کا رنگ دینے میں شاعر کی فنکاری اور زبان دانی کا مظاہرہ ضرور ہوتا ہے۔

بلا شبہ احمد فراز ہندوستان اور پاکستان کے غزل گو شعراء میں محبوب اور مشہور ہیں ۔ اس کے ساتھ ہی وہ اردو نظم کا بھی ایک اہم نام ہیں۔ ان کی غزلوں نظموں اور ڈراموں کی اہم کتب کے نام ہیں:۔

تنہا تنہا، درد آشوب، خواب گل پریشاں، جاناں جاناں، بس انداز موسم، بودلک، موم کے پتھر (ڈرامے) سب آوازیں میری ہیں، شب خون اور غزل بہانہ کرو وغیرہ۔''احمد فراز کی شاعری'' کے عنوان سے پروفیسر ظہور الدین (جموں توی) نے ہفت روزہ ہماری زبان میں لکھا ہے۔

> ''صحت مند روایت کی پاسداری اور نئے آفاق تک رسائی حاصل کرنے کا جہاں تک تعلق ہے بیسویں صدی کے بہت کم شاعر آپ کی ہم سری کا دعویٰ کر سکتے ہیں اگرچہ آپ کے ہم عصروں میں ایک ظرف اگر ناصر کاظمی، احمد ندیم قاسمی، منیر نیازی، شکیب جلالی، کشور ناہید اور پروین شاکر ہیں تو دوسری طرف خلیل الرحمٰن اعظمی، شہر یار، بشیر بدر، ندا فاضلی، اختر الایمان ، جذبی، بانی، مخمور سعیدی وغیرہ کے نام لئے جاسکتے ہیں۔''

احمد فراز کے تمام مجموعوں کو جمع کر کے ''شہر سخن آراستہ ہے'' کے نام سے ایک جلد کی شکل میں پاکستان میں شائع کر دیا گیا ہے۔

احمد فراز کے کلام اور خاص طور پر ان کی لکھی ہوئی غزلوں کے مطالعہ سے جو ان کی خصوصیت کا پتہ چلتا ہے اس میں فکر کی گہرائی بات میں وسعت بہت ہے۔ ان کی فکر اور ان کے جذبوں میں تازگی ہے۔ فکر کی گہرائی کے ساتھ اس میں جمالیاتی رنگ و آہنگ بھی خوب ہے مثلاً

کسی کو گھر سے نکلتے ہی مل گئی منزل
کوئی ہماری طرح عمر بھر سفر میں رہا

☆

ایک فراز تمھیں تنہا ہو جواب تک دکھ کے رسیا ہو
ورنہ اکثر دل والوں نے درد کا رستہ چھوڑ دیا

احمد فراز کی غزل میں روایت کی پاسداری ہے اور اونچائیوں کو چھونے کی کوشش کے ساتھ ساتھ احساس کی شدّت بھی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

کہا تھا کس نے تجھے آبرو گنوانے جا
فراؔز اور اسے حالِ دل سنانے جا

☆

میں خود کو بھول گیا تھا مگر جہاں والے
اداس چھوڑ گئے آئینہ دکھا کے مجھے

☆

تو لاکھ فراؔز اپنی شکستوں کو چھپائے
یہ چُپ تو ترے کرب کا اظہار کرے ہے

☆

یہ میرے ساتھ کیسی روشنی ہے
کہ مجھ سے راستہ دیکھا نہ جائے

احمد فراز کے متعلق یہاں تک تو میں نے ان کی زندگی میں لکھ لیا تھا لیکن ۲۵ر اگست ۲۰۰۸ء کو اچانک موبائل پر خبر آئی کہ ''احمد فراز نہیں رہے'' یقین نہیں آیا کیوں کہ اس وقت تک نہ کسی اخبار میں چھپا تھا نہ ٹی وی پر خبروں میں آیا تھا۔ اس کے بعد مختلف ذریعوں سے جو معلومات حاصل ہوئی وہ یہ کہ احمد فراز کے گردے خراب ہو گئے تھے اور وہ شکاگو میں زیر علاج تھے۔ جب زندگی سے مایوسی نظر آنے لگی اور ان کو لمبے لمبے بے ہوشی کے دورے پڑنے لگے تو ان کے بیٹے شبلی انھیں پاکستان لے گئے۔ اس عرصہ میں ان کی یادداشت پر بھی اثر پڑا اور رشتہ داروں کو پہچاننا بھی دشوار ہو رہا تھا۔

پاکستان میں ان کو راولپنڈی کے 'الشفا' ہسپتال میں داخل کر دیا۔ لیکن ایک لمبی بے ہوشی کے بعد ان کا ۲۵ر اگست ۲۰۰۸ء کی شب میں انتقال ہو گیا۔

احمد فراز کے جانے سے شاعری کی دنیا میں ایک خلاء سا محسوس ہونے لگا۔ بے شک وہ غزل اور نظم کے بہت بڑے شاعر تھے۔

جو عمر گزاری ہے بڑھی دھج سے گزاری
اب کوئی خوشی ہے نہ کوئی غم کہ چلا میں

احمد فراز

حرف تڑپے گا، مگر اذن سخن چھن جائے گا
روشنی ہوگی مگر آنکھیں بجھا دی جائیں گی

احمد فراز

پاکستان میں ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں ان کو "ہلال امتیاز" کے اعزاز سے نوازا لیکن انھوں نے اس اعزاز کو قبول نہیں کیا۔ کراچی یونیورسٹی نے انھیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری سے نوازا جو انہوں نے خوشی سے قبول کرلی تھی۔

فراز نے پہلے ایک جرمن خاتون سے شادی کی جو کامیاب نہیں ہوئی اس کے بعد ریحانہ گل سے نکاح کیا۔ ان کا بیٹا شبلی ایک فوجی افسر ہے۔

فراز چاہتے تھے کہ ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات بہتر ہوجائیں جس کے لئے انھوں نے نظمیں بھی لکھیں وہ ہمیشہ بھائی چارے، امن، دوستی اور عام آدمی کو انصاف دلانے کے لئے کوشاں رہتے تھے۔

## بشیر بدر

پیدائش: ۱۵رفروری ۱۹۳۵ء بمقام کانپور

بشیر بدر کی پیدائش کانپور میں ہوئی۔ ان کے بزرگ ایران سے آئے تھے جو لاہور دہلی وغیرہ کے بعد فیض آباد میں مقیم رہے۔ آج بھی بشیر بدر کے خاندان کے لوگ فیض آباد لکھنؤ میں رہتے ہیں۔ ڈاکٹر بشیر بدر کی والدہ کا نام عالیہ بیگم اور والد کا نام شاہ محمد نظیر تھا۔ بشیر بدر جب دسویں جماعت میں پڑھتے تھے تب ان کے والد اس دنیا سے رخصت ہوگئے اور خاندان کی ذمہ داری بشیر بدر کے کاندھوں پر آگئی۔

والد صاحب کی موجودگی میں بشیر بدر نے شاعری کرنا شروع کردیا تھا۔ ان کا پہلا شعر جس پر ان کے والد نے ناراض ہوکر شاعری کرنے سے منع کیا تھا وہ یہ ہے:

ہوا چل رہی ہے اُڑا جا رہا ہوں
تیرے عشق میں میں مرا جا رہا ہوں

(بشیر بدر۔ عمر گیارہ برس)

بشیر بدر شروع سے ہی موزوں طبع تھے۔ ان کا یہ شعر اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ عاشق مزاج ہونے کے ساتھ ساتھ ہوا کے دوش پر اُڑنا اور زمانے کے ساتھ چلنا چاہتے ہیں۔ بشیر بدر غزل کے مقبول ترین شاعر ہیں۔ ہندوستان اور پاکستان کے نمائندہ رسائل میں بشیر بدر کی غزلیں پابندی سے شائع ہوتی رہتی ہیں۔ بشیر بدر کی مقبولیت کا راز یہ بھی ہے کہ وہ مشاعروں کے بھی بہت مقبول شاعر ہیں لیکن ادبی حلقوں میں ان کی حددرجہ پذیرائی کی جاتی رہی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ایم اے۔ اردو نصاب میں ان کی غزلیں شامل رہی ہیں۔

بشیر بدر کو ۱۹۸۴ء میں کراچی کے ایک مشاعرے میں بلایا گیا۔ اس وقت شائقین مشاعرہ کا کہنا تھا کہ بشیر بدر مشاعرہ لوٹ لیتے ہیں۔ ان کے کلام کے ساتھ ان کی آواز ترنم اور انداز سے لوگ ان کے دیوانے ہوجاتے ہیں۔

روزنامہ امن کراچی ۱۳ر مئی ۱۹۸۴ء (صفحہ نمبر ۵) میں بشیر بدر کے لئے لکھا ہے:

''بشیر بدر عوام و خواص میں یکساں مقبول ہیں۔ کراچی میں غزل کے عاشق ان کے عاشق ہیں۔ ابھی سکھر کے پاک و ہند مشاعرے میں ان کو تاریخ ساز کامیابی ملی۔ ہزاروں افراد ان کے احترام میں کھڑے ہوکر ان کو دوبارہ آنے کی دعوت دیتے

رہے...... بشر بدر جتنا ہندوستان میں پسند کئے جاتے ہیں اتنا ہی پاکستان کے عوام وخواص ان سے محبت کرتے نظر آتے ہیں۔''

غزل کی شاعری میں انگریزی سے آئے ہوئے لفظ پوری سنجیدگی اور شاعرانہ تغزل کے ساتھ بشیر بدر کی غزل میں سب سے پہلے آئے۔ اب ہندوستان اور پاکستان کے اکثر نئے شعراء نے بشیر بدر کا اسلوب اختیار کرلیا ہے:

وہ زعفرانی ''پلوور'' اسی کا حصّہ ہے
کوئی جو دوسرا پہنے تو دوسرا ہی لگے

☆

کوئی پھول دھوپ کی پتیوں سے ''ہرے ربن'' سے بندھا ہوا
وہ غزل کا لہجہ نیا نیا نہ کہا ہوا نہ سنا ہوا

☆

یہاں لباس کی قیمت ہے آدمی کی نہیں
مجھے ''گلاس'' بڑے دے شراب کم کردے

☆

''ریل'' کی پٹری پر مری شہرت رکھ دی
''بس'' کے پہیوں سے روزی روٹی باندھی

اس انفرادیت سے الگ بشیر بدر کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ گذشتہ پچاس سال میں ان کے لاتعداد اشعار غیر معمولی طور پر مشہور ہوئے اور تمام لسانی حدود کو توڑ کر دنیا بھر میں پسند کئے گئے جہاں جہاں اردو غزل کے شائقین موجود ہیں۔ ان میں سے بطور نمونہ

چند شعر پیش ہیں:

اُجالے اپنی یادوں کے ہمارے ساتھ رہنے دو
نہ جانے کس گلی میں زندگی کی شام ہو جائے

☆

دشمنی جم کر کرو لیکن یہ گنجائش رہے
جب کبھی ہم دوست ہو جائیں تو شرمندہ نہ ہوں

☆

لوگ ٹوٹ جاتے ہیں ایک گھر بنانے میں
تم ترس نہیں کھاتے بستیاں جلانے میں

☆

مخالفت سے مری شخصیت سنورتی ہے
میں دشمنوں کا بڑا احترام کرتا ہوں

☆

کوئی ہاتھ بھی نہ ملائے گا جو گلے ملو گے تپاک سے
یہ نئے مزاج کا شہر ہے ذرا فاصلے سے ملا کرو

بشیر بدر نے بول چال کی زبان کا جو پُر اثر لہجہ دریافت کیا ہے اس کی وجہ سے ان کی اردو رسم الخط میں تو کئی کتابیں ہیں لیکن اس کے علاوہ ہندی، پنجابی، گجراتی، انگریزی اور دیگر زبانوں میں ان کے انتخابات شائع ہو چکے ہیں۔

بشیر بدر کے متعلق چند معتبر ترین نقادوں کی رائے رسالہ ''شاعر'' ممبئی جلد ۵۴،

شمارہ نمبر ۴، ۳، ۱۹۸۳ء میں شائع ہوئی ہیں جو درج ذیل ہیں :

محمد حسن :-

''غزل گو کی حیثیت سے بشیر بدر کی صلاحیتوں پر ایمان نہ لانا کفر ہے۔''

آل احمد سرور:-

''نئی غزل میں ہندوستان اور پاکستان میں جو نام بہر حال آئیں گے ان میں بشیر بدر کا نام بھی ہوگا۔''

ندا فاضلی :-

''بشیر بدر کی آواز دور سے پہچانی جاتی ہے۔ یہ بہت بڑی بات ہے۔''

ویسے تو بشیر بدر کے کئی شعر بہت مقبول ہوئے لیکن اجالے اپنی یادوں کے...... شعر کی شہرت بشیر بدر کی اپنی شہرت سے کئی گنا زیادہ بڑی ہے کیوں کہ سواریوں سے لے کر دفتروں، لیڈروں، طالب علموں تک ہر جگہ یہ شعر نظر آجاتا ہے اور پہنچ چکا ہے۔ یہاں ایک واقعہ خود رقم الحروف کے ساتھ بھی پیش آیا کہ جب میں نے اپنے ایک استاد سے ان کے آٹو گراف لئے تو انہوں نے مجھے بشیر بدر کا یہی شعر لکھ کر دیا۔

اُجالے اپنی یادوں کے ہمارے ساتھ رہنے دو
نہ جانے کس گلی میں زندگی کی شام ہو جائے

میری دعا ہے کہ تم کو زندگی میں کامیابی ملے۔

دعا گو ڈاکٹر محمد شریف خاں، ۲ مئی ۱۹۷۵ء

اس میں دلچسپ بات یہ تھی کہ نہ مجھے معلوم تھا کہ یہ کس کا شعر ہے نہ میرے استاد کو۔ اس شعر کی شہرت کا یہ عالم تھا کہ اس نے اپنے شاعر کی شہرت کو بہت پیچھے چھوڑ دیا۔

بشیر بدر نے شاعری کی تجربہ گاہ میں ایک اور تجربہ کیا تھا جس کو انہوں نے ''نثری غزل'' نام دیا تھا لیکن اس تجربہ سے وہ خود مطمئن نہیں تھے۔ اس لئے چند نثری غزلیں لکھ کر اس تجربہ کو ترک کر دیا۔ ''ماہ نامہ فنون'' مئی ۲۰۰۸ء (Vol.111) Issue (V) اور رنگ آباد میں علیم صبا نویدی کا مضمون ...... ''اردو شاعری میں ہئیتی تجربے'' میں انھوں نے لکھا ہے:

> ''اردو غزل سے جس طرح آزاد غزل کا وجود ہوا اسی طرح ''نثری غزل'' بھی وجود میں آئی جس کے موجد بشیر بدر ہیں۔ ان کی نثری غزلیں ہفت روزہ ''مورچہ'' (گیا) ۸رجولائی ۱۹۷۲ء میں شائع ہوئیں۔ موصوف نے اپنی نثری غزلوں کے مختلف نمونے (Pettern) رکھے ہیں۔ مثلاً:
>
> ا۔ ایسا طاقت ور تخلیقی تجربہ جسے پرانے آہنگ کے ساتھ مرتب ہونے کی قطعی ضرورت نہ ہو۔
>
> ۲۔ ایسے برابر مصرعے جن کی تقطیع کی جائے تو نئے وزن میں برابر ہوں مگر مروجہ شعری اوزان کے مطابق نہ ہوں۔
>
> ۳۔ نثری فقرے یا جملے جو شاعری ہیں مگر پرانی نثر میں کم ہیں ان کو مصرعہ مان کر شعری غزلیں کہنا۔

غالباً موصوف نے بیس نثری غزلیں کہی ہیں جن میں صرف چار نثری غزلیں ''مورچہ'' کے لئے روانہ کیں تھیں ان کی نثری غزلوں میں محاکاتی اور افسانوی ڈھنگ ہے۔ الفاظ میں کھردرا پن، کہیں کہیں زبان میں سطحی پن عود کر آیا ہے۔ شاید جان بوجھ کر اس زبان اور ڈھنگ کو نثری غزل کا لازمہ قرار دیا ہو۔ ان کا خیال ہے کہ غزل کی ہزار تہیں ہیں۔ ان کی اوپری تہوں میں ایک ایسی دلدلی تہہ ہے جس میں کند ذہن ہاتھ پاؤں مارتا اور دھنستا رہتا ہے اور شاعر تماشہ دیکھنا پسند کرتا ہے۔ مگر ناچیز نے جو نثری غزلیں کہی ہیں ان میں ان دلدلی تہوں کا شائبہ دور تک نہیں ملتا۔''

(ماہنامہ فنون، اورنگ آباد۔ مئی ۲۰۰۸ء)

بشر بدر نے اپنے شعری سفر کے ابتدائی دور میں نظمیں بھی لکھیں جو ماہنامہ ''شاعر''، ممبئی ستمبر ۱۹۵۱ء میں ''ماضی و حال'' کے عنوان سے چھپیں۔ ''غالب سے شکایت'' نئی قدریں حیدر آباد (پاک) جلد نمبر ۳ شمارہ نمبر ۶، صفحہ نمبر ۹۸ پر شائع ہوئی تھیں۔ اس نظم کا آخری شعر تھا:

''یہ یقیں رکھئے بہر حال ہمیں ملنا ہے
جیسے تاریخ کے اوراق بہم ہوتے ہیں''

ڈاکٹر رفعت سلطان کی کتاب ''بشیر بدر نئی آواز'' جو ۲۰۰۱ء میں شائع ہوئی ہے، صفحہ ۱۰۴ پر لکھتی ہیں:

''بشیر بدر نے غزل کے مزاج کے کردار غزل کی نزاکت، معصومیت اور تقدس کو مجروح کئے بغیر نئی سوچ نئے لہجہ کے ساتھ عصری حیثیت کو اس طرح گرفت میں لیا ہے کہ شعر کی ادبی متن کو پس منظر میں جانے نہیں دیا، یہ ایک مشکل کام تھا۔ اس مشکل کو حل کرنے کے لئے انھوں نے اپنے تجربات اور مشاہدات کی بنیاد تعقل کے بجائے وجدان پر رکھی اس لئے ان کی غزل کی جڑیں دل کی گہرائیوں میں اتری ہوئی ہیں۔ دل کی مٹی کو نرم کرنے کے لئے آنسوؤں کا بہاؤ الٹی طرف ہوتا ہے۔ شعر:

اب کے آنسو آنکھوں سے دل میں اترے
رُخ بدلا دریا نے کیسے بہنے کا

بشیر بدر نے نئی غزل کو لفظی اور معنی سطح پر بہت کچھ دیا ہے۔''

(نئی آواز۔ ڈاکٹر رفعت سلطان)

بشیر بدر اپنی غزل کی متعدد کتابوں کے ساتھ ساتھ مشاعروں کے مقبول شاعر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مشاعروں کے اثرات نے ان کی شاعری کی زبان اسلوب اور لہجہ کو بدل کر رکھ دیا۔ ''آمد'' اور ''امیج'' کی غزلیں فارسی ترکیبوں سے اور اضافتوں سے پاک ہونے لگیں ورنہ ان کی غزلوں کے پہلے مجموعے ''اکائی'' میں بے شمار اشعار فارسی ترکیبوں سے بوجھل نظر آتے ہیں۔ بشیر بدر ''آمد'' میں خود لکھتے ہیں:

''اب غزل کا عالمی اور جدید منظر نامہ فارسی زدہ اردو غزل کے طریقۂ کار اور منظر نامہ سے مختلف ہو چلا ہے۔ یہ کارنامہ میرا ہے

کہ میری غزل اس سفر کا آغاز تھی۔"

بشیر بدر کی اور بہت سی خوبیوں کے ساتھ کہ وہ بہت صاف گو اور صاف دل انسان ہیں غصہ انہیں کم آتا ہے۔ سلیقہ اور سادگی کے ساتھ مزاج میں انکساری، بے حدر رحم دل اور مہربان انسان ہیں۔ دشمن کسی کو سمجھتے نہیں اور اگر ان کو سمجھا دیا جائے کہ فلاں انسان دشمنی کر رہا ہے تو بھی مشکل سے اس کا یقین کرنا۔ ہر ایک پر حد درجہ اعتماد، ان کی زندگی کی کوئی بات راز میں کبھی نہیں رہی۔ کھلی کتاب کی طرح ان کی ادبی اور گھریلو زندگی ہے۔ کم درجہ پر کوئی بھی کام کرنا کبھی بھی منظور نہیں ہوا۔ یہی وجہ تھی کہ زندگی کے حالات سازگار ہونے کے بعد دیر سے ایم اے اور پھر پی ایچ ڈی کرنے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پہنچے۔

بشیر بدر نے ۱۹۶۹ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے امتیازی طور پر اردو میں ایم اے کیا۔ امتیازات میں یہ شامل ہے کہ جب ۱۹۶۸ء میں بشیر بدر نے ایم اے پری ویس کیا تو ایم اے کے تمام دوسرے مضامین کے ٹاپرس طلباء میں سب سے زیادہ نمبر لانے کا ریکارڈ بشیر بدر کا تھا تب انہیں انگلینڈ کے ایک پروفیسر کے نام سے "سرولیم مارس اسکالرشپ" ملا۔ اس کے بعد ۱۹۶۹ء میں تمام ایم اے (فائنل) کے مضامین کے طلباء میں ٹاپ کرنے والوں میں اوّل آئے تو "رادھا کرشن پرائز" ملا۔ تعلیمی سلسلہ جاری رکھتے ہوئے پروفیسر آل احمد سرور کی نگرانی میں پی ایچ ڈی کا مقالہ "آزادی کے بعد کی غزل کا تنقیدی مطالعہ" لکھا۔ ۱۹۷۲ء میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری ملنے کے بعد وہیں لیکچرر ہو گئے۔ کچھ عرصہ بعد علی گڑھ سے میرٹھ کالج میں ریڈر اور صدر شعبۂ اردو کی حیثیت سے درس و تدریس میں لگے رہے۔ اس میں شک نہیں کہ بشیر بدر کی غزل مقبول خاص و عام ہے۔ وہ

اردو غزل کے محبوب شاعر تو ہیں ہی ناقدین بھی ان کی شاعری کو نظر انداز نہیں کر پاتے۔

بشیر بدر جیسی تخلیقی صلاحیت کے شاعر غزل کی دنیا میں بہت کم ہیں۔ ایسے نوجوان شاعر تو بہت ہیں جو مشاعروں میں بشیر بدر کی نقل کر کے ان کی بے پناہ مقبولیت سے رشک و حسد کرتے ہیں اور ان کے بنائے ہوئے اسلوب پر چلنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

ابتداء سے ابھی تک بشیر بدر کی غزل میں ایک نیا پن ملتا ہے۔ ''اکائی'' کی شاعری کے بعد سے بشیر بدرؔ کے کلام میں اضافت نہیں ملتی، ان کی غزل روایتی علامتی اظہارات سے عاری ہے۔ اپنے جذبہ اور احساس کی آہٹوں کو انہوں نے تخیل کی نگہداری میں اس طرح سمیٹا ہے کہ ان کی غزل میں پیکروں کا جلترنگ سا سنائی دیتا ہے۔

بشیر بدر استعاراتی اور تمثیلی اظہار سے مناسبت کے باوجود وہ تشبیہ سے منحرف نہیں ہوتے اور اس سے پیکر آفرینی کا کام لیتے ہیں لیکن ان کے اشعار میں محسوس ہوتا ہے کہ تجربہ کی تازگی نے از خود موزوں تشبیہات تلاش کر لی ہیں۔ ایسی تشبیہات جو دوسرے شعراء کے یہاں نایاب ہیں، مثلاً:

باتیں کہ جیسے پانی میں جلتے ہوئے دیئے
کمرے میں نرم نرم اجالا سا بھر گیا

☆

رات کی بھیگی بھیگی چھتوں کی طرح
میری پلکوں پہ تھوڑی نمی رہ گئی

بشیر بدر کے یہاں رات کا پیکر بے حد نمایاں ہے۔ لگتا ہے کہ شاعری کی

اندرونی اداسی اور رات کا گہرا رشتہ ہے۔ ان کے یہاں رات اکثر خنک چاندنی اور جھل مل کرتے تارے ساتھ لاتی ہے۔ ان کے یہاں رات خواب کے گاؤں بساتی ہے۔ رومان انگیز فضا پیدا کرتی ہے۔

بوجھل اداس رات تھی دونوں دلوں کے بیچ
ہم مسکرا دیئے تو اجالے برس پڑے

☆

پیچھے پیچھے رات تھی تاروں کا اک لشکر لئے
ریل کی پٹری پہ سورج چل رہا تھا رات کو

☆

رات بھیگی تو تھکے شہر کو یاد آنے لگے
نیند کے گاؤں جو آباد ہیں پلکوں کے تلے

☆

یاد جب گھر کی کبھی آتی ہے تو لگتا ہے
رات کی راہ میں شیشے کا مکان روشن ہے

بشیر بدر کے یہاں کئی ایسے الفاظ بار بار آتے ہیں جو قاری کو بہت متاثر کرتے ہیں مثلاً برف، ہوا چاند، جگنو، ستارے، دریا، گھر، دھوپ، صبح، شام گاؤں وغیرہ وغیرہ۔ بشیر بدر کی غزل سے پہلے غزل میں گاؤں داخل نہیں ہوا تھا۔ بشیر بدر نے اپنی غزل میں گاؤں کی معصوم سیدھی سادھی زندگی کی تصویریں دکھائی ہیں۔ مثلاً

دھوپ کھیتوں میں اتر کر زعفرانی ہوگئی
سرمئی اشجار کی پوشاک دھانی ہوگئی

☆

دھوپ میں کھیت گنگنا نے لگے
جب کوئی گاؤں کی جیالی ہنسی

☆

میری مٹھی میں سلگتی ریت رکھ کر چل دیا
کتنی آوازیں دیا کرتا تھا یہ دریا مجھے

☆

سر پر کھڑے ہیں چاند ستارے بہت مگر
انسان کا جو بوجھ اٹھالے زمین ہے

☆

میں تمام تارے اُٹھا اُٹھا کے غریب لوگوں میں بانٹ دوں
کبھی ایک رات وہ آسماں کا نظام دیں میرے ہاتھ میں

☆

مرا کیا کہیں بھی چلا جاؤں گا
مگر راستہ تو بنا جاؤں گا

☆

عجیب شخص ہے ناراض ہو کے ہنستا ہے
میں چاہتا ہوں خفا ہو تو وہ خفا ہی لگے

بشیر بدر بہت زیادہ حساس ، انسان دوست اور درد مند شاعر ہیں۔ وہ اپنی

شاعری میں جن رموز واشارات سے کام لیتے ہیں وہ بہت نازک اور لطیف ہوتے ہیں۔ بشیر بدر عام انسانوں کی طرح جینے کا ہنر جانتے ہیں۔ بشیر بدر نے بے شمار الفاظ تخلیقی حسن کے ساتھ غزل میں داخل کر دئے جن کو غزل میں اس سے پہلے قبول نہیں کیا گیا تھا۔ ظفر اقبال نے بھی کوشش ضرور کی تھی لیکن بشیر بدر کی کوششیں زیادہ کامیاب اور مقبول ہوئیں۔ بشیر بدر کے یہاں بول چال کے الفاظ ایسے غزل میں اپنی جگہ بنا لیتے ہیں کہ پڑھنے اور سننے والے تعریف کئے بغیر نہیں رہتے۔ مثلاً

وہ بالکونی میں آئے تو راستہ رُک جائے
سڑک پہ چلنے لگے تو ہمارے جیسا ہے

☆

سنسان راستوں سے سواری نہ آئے گی
اب دھول سے اَٹی ہوئی لاری نہ آئے گی

☆

گزارے ہم نے کئی سال ایسے دفتر میں
کنواری لڑکی رہے جیسے غیر کے گھر میں

☆

بہت سنبھال کے رکھا تھا نیک بیوی نے
ہوا چلی تو برادہ بکھر گیا گھر میں

☆

بلڈنگیں لوگ نہیں ہیں جو کہیں بھاگ سکیں
روز انسانوں کا سیلاب بڑھا جاتا ہے

بشیر بدر کی کامیابی کا راز یہ ہے کہ وہ عام جذبات کو بول چال کی زبان میں بڑی سادگی اور خوبصورتی کے ساتھ غزل بنا دیتے ہیں۔ ان کے کلام میں بناوٹ یا تصنع نہیں ہے۔ ان کے یہاں اپنی مٹی کی بھینی خوشبو کا احساس اور گاؤں اور قصبات کی یادیں بھری پڑی ہیں:

گیلے گیلے مندروں میں بال کھولے دیویاں
سوچتی ہیں ان کے سورج دیوتا کب آئیں گے

غزل کے معتبر نقاد ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے اپنی مشہور تنقیدی کتاب "اردو غزل"، صفحہ ۱۵۷ کے چوتھے ایڈیشن کا اختتام بشیر بدر کے اس شعر پر کیا ہے:

اُجالے اپنی یادوں کے ہمارے ساتھ رہنے دو
نہ جانے کس گلی میں زندگی کی شام ہو جائے

کوئی پچاس سال سے زیادہ عمر کا بشیر بدر کا یہ شعر شہرت کے مقابلے میں بشیر بدر کی شہرت سے کئی قدم آگے نکل گیا۔ اس کی وجہ عام فہم زبان میں شعر کا ہونا اور شائقین کی سہل پسندی ہے۔ بشیر بدر کے یہاں ایسے کئی اشعار مل جائیں گے جو سادہ زبان کے ساتھ گہرائی اور معنویت کے لحاظ سے بہت اہم ہیں، مثلاً:

میری شہرت سیاست سے محفوظ ہے
یہ طوائف بھی عصمت بچا لے گئی

☆

خدا ایسے ایمان کا نام ہے
رہے سامنے اور دکھائی نہ دے

☆

جی بہت چاہتا ہے سچ بولیں
کیا کریں حوصلہ نہیں ہوتا

☆

کچھ تو مجبوریاں رہی ہوں گی
یوں کوئی بے وفا نہیں ہوتا

☆

کبھی جب تمہارا خیال آگیا
کئی روز تک بے خیالی رہی

☆

تم ابھی شہر میں کیا نئے آئے ہو؟
رُک گئے راہ میں حادثہ دیکھ کر

☆

سر پر زمین لے کے ہواؤں کے ساتھ جا
آہستہ چلنے والے کی باری نہ آئے گی

بشیر بدر کی زندگی میں حادثات بھی بہت آئے جن کو انھوں نے بڑے ہی حوصلے کے ساتھ برداشت کیا اور ان کو اپنے اوپر حاوی نہیں ہونے دیا۔ اشعار بھی بہت سلیقے سے کہے:

لوگ ٹوٹ جاتے ہیں ایک گھر بنانے میں
تم ترس نہیں کھاتے بستیاں جلانے میں

بشیر بدر اپنے شعری سفر سے بہت کامیاب گزرے ہیں۔ ان کی شہرت اور ہر دلعزیزی کا ایک نمونہ جو ان کے گھر میں موجود ہے وہ ایک ایسی چادر ہے جس پر ان کی شاعری کو پسند کرنے والی ڈاکٹر اختر جہاں ملک نے (جو دبئی میں مقیم ہیں) ۲۷ اشعار کاڑھ کر دئے ہیں۔ اپنے ہاتھ سے خوش خط میں پہلے لکھا اس کے بعد اسکو ریشم سے کاڑھا ہے۔ یہ چادر انہوں نے ''جشن بشیر بدر ۲۰۰۰ء'' کے موقع پر بشیر بدر کو پیش کی تھی۔ اس چادر پر ۲۸ ستمبر ۲۰۰۰ء تاریخ بھی لکھی ہوئی ہے۔

بشیر بدر کے شعروں میں معنویت، معصومیت اور قاری کے لئے کچھ نہ کچھ دلچسپی کا سامان ضرور ہوتا ہے جسے پڑھ کر بے ساختہ منہ سے یہی نکلتا ہے کہ یہ تو میرے دل کی بات ہے۔ مثلاً یہ شعر ملاحظہ ہوں:

پہلی بار نظروں نے چاند بولتے دیکھا
ہم جواب کیا دیتے کھو گئے سوالوں میں

☆

سب کھلے ہیں کسی کے عارض پر
اس برس باغ میں گلاب کہاں

☆

ہنس پڑی شام کی اداس فضا
اس طرح چائے کی پیالی ہنسی

☆

جس دن سے چلا ہوں میری منزل پہ نظر ہے
آنکھوں نے کبھی میل کا پتھر نہیں دیکھا

☆

میرے بستر پہ سو رہا ہے کوئی
میری آنکھوں میں جاگتا ہے کوئی

☆

بہت دنوں سے مرے ساتھ تھی مگر کل شام
مجھے پتہ چلا وہ کتنی خوبصورت ہے

☆

اب ملے ہم تو کئی لوگ بچھڑ جائیں گے
انتظار اور کرو اگلے جنم تک میرا

بشیر بدر کے یہاں جدید موضوعات، لفظیات اور جدید زندگی کے تجربات پر کئی اشعار ملتے ہیں۔ مثلاً

مچھلیاں چل رہی ہیں پنجو پر
جن کے چہرے ہیں لڑکیوں جیسے

☆

چڑھا کے پیٹھ پہ بکری کے بچے گھومیں گے
یہ دنیا اب ہمیں سرکس کا شیر کردے گی

☆

نہیں ہے میرے مقدر میں روشنی نہ سہی
یہ کھڑکی کھولو ذرا صبح کی ہوا ہی لگے

☆

اتنی ملتی ہے مری غزلوں سے صورت تیری
لوگ تجھکو میرا محبوب سمجھتے ہوں گے

☆

اک سمندر کے پیاسے کنارے تھے ہم اپنا پیغام لاتی تھی موج رواں
آج دو ریل کی پٹریوں کی طرح ساتھ چلنا ہے اور بولنا تک نہیں

☆

برف سی اجلی پوشاک پہنے ہوئے پیڑ جیسے دعاؤں میں مصروف ہیں
وادیاں پاک مریم کا آنچل ہوئیں آؤ سجدہ کریں سرجھکائیں کہیں

☆

آنکھیں آنسو بھری پلکیں بوجھل گھنی جیسے جھیلیں بھی ہوں نرم سائے بھی ہوں
وہ تو کہیئے انہیں کچھ ہنسی آگئی بچ گئے آج ہم ڈوبتے ڈوبتے

بشیر بدر کا اپنا منفرد اور خوبصورت لہجہ ہے۔ جو دور سے پہچانا جا سکتا ہے۔ بشیر بدر کے یہاں زندگی کی پوری ترجمانی ملتی ہے۔ وہ غم یا خوشی یا کسی خاص نظریۂ میں خود کو قید نہیں کرتے۔ انہوں نے کلپنا چاؤلہ کے والدین کے غم کو محسوس کیا۔ کلپنا چاؤلہ جو خلاء میں امریکہ سے گئی اور واپس آتے ہوئے اسپیس شٹل راستے میں ہی جل کر ختم ہوگیا۔ بشیر بدر نے اس غم کو محسوس کیا اور لکھا:

کلپنا کھو گئی ہے تاروں میں
اپنی بچی کو ڈھونڈ لاؤں کیا؟

آج سنڈے ہے کل بھی چھٹی ہے

آسمانوں میں گھوم آؤں کیا؟

بشیر بدر کی ایک مشہور غزل جس میں حمدیہ اور نعتیہ شعر ہیں، جنکو پڑھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ بشیر بدر بڑے خلوص اور انکساری سے اپنا نظرانہ عقیدت اللہ اور اس کے رسولؐ کی خدمت میں پیش کرتے ہیں:-

خدا ہم کو ایسی خدائی نہ دے

کہ اپنے سوا کچھ دکھائی نہ دے

مجھے ایسی جنّت نہیں چاہئے

جہاں سے مدینہ دکھائی نہ دے

میں اشکوں سے نام محمدؐ لکھوں

قلم چھین لے روشنائی نہ دے

خدا ایسے ایمان کا نام ہے

رہے سامنے اور دکھائی نہ دے

اس مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ بشیر بدر جدید غزل کے اہم شاعر ہیں جن کا اثر ان کے معاصرین قبول کر رہے ہیں۔ بشیر بدر کے مجموعے جو مختلف زبانوں میں شائع ہوئے، رسالوں نے ان پر نمبر نکالے، کئی اعزازات اور انعامات سے ان کو نوازا گیا۔ اس کے علاوہ جن فرائض کو ان کے سپرد کیا گیا ان کو خوش اسلوبی سے انجام دیا۔ اس کی تفصیل آگے دی جا رہی ہے۔

## بشیر بدر کا کلام مختلف زبانوں میں

| نمبر شمار | کتاب کا نام | مرتب / مصنف | پبلشر / سیلر، سن |
|---|---|---|---|
| | **رسم الخط اردو** | | |
| ۱ | اکائی | بشیر بدر | لیتھو کلر پرنٹس علی گڑھ (۱۹۶۹ء)، کالج اینڈ یونیورسٹی بک اسٹال، علی گڑھ |
| ۲ | بشیر بدر۔ نئی غزل کا ایک نام | ندا فاضلی | دریا گنج نئی دہلی (۱۹۹۷ء) |
| ۳ | آس | بشیر بدر | حسامی بک ڈپو، حیدر آباد (۱۹۹۲ء) |
| ۴ | آمد | بشیر بدر | مکتبہ دین ادب، امین اردو ولہ پارک لکھنؤ۔ |
| ۵ | امیج | بشیر بدر | حسامی بک ڈپو، حیدر آباد (۱۹۹۲ء) |
| ۶ | آمد (ترمیم اور اضافے کے ساتھ) | بشیر بدر | مکتبہ عمران ڈائجسٹ، اردو بازار کراچی |
| ۷ | امیج۔ بشیر بدر کی غزلیں | بشیر بدر | فضلی سینٹر، کراچی (۱۹۹۶ء) |
| ۸ | آسمان | بشیر بدر | فضلی سینٹر، کراچی (۹۳-۱۹۹۶ء) |
| ۹ | آہٹ ۔ بشیر بدر کی غزلیں | ناصر ریاض | مکتبہ عمران ڈائجسٹ اردو بازار کراچی (۱۹۹۴ء) |

۱۰ کلیات بشیر بدر اوّل طارق مکتبہ عمران ڈائجسٹ اردو بازار کراچی
ایڈیشن سبزواری (۱۹۹۶ء)

۱۱ کلیات بشیر بدر دوم طارق مکتبہ عمران ڈائجسٹ اردو بازار کراچی
ایڈیشن سبزواری (۱۹۹۶ء)

۱۲ کلیات بشیر بدر سوئم طارق مکتبہ عمران ڈائجسٹ اردو بازار کراچی
ایڈیشن سبزواری (۱۹۹۶ء)

۱۳ کوئی شام گھر بھی رہا وصی شاہ کراچی پاکستان
کرو۔ بشیر بدر

۱۴ اللہ حافظ بشیر بدر ماورا پبلشرز، بہاولپور روڈ، لاہور
(بشیر بدر کی غزلیں) (۲۰۰۱ء)

۱۵ کوئی شام گھر بھی رہا کرو ناصر ریاض ناصر پبلیکیشن، اردو بازار کراچی

۱۶ آمد (بشیر بدر کی غزلیں) طارق سبزواری ناصر پبلیکیشن، اردو بازار کراچی

۱۷ آسمان حبیب احمد اور ناصر پبلیکیشن، اردو بازار کراچی
(بشیر بدر کی غزلیں؟) اقبال مسعود (۱۹۹۱ء)

۱۸ آس بشیر بدر ناصر پبلیکیشن، اردو بازار کراچی

۱۹ کلیات بشیر بدر بشیر بدر کتب خانہ خورشیدہ، اردو بازار، لاہور

۲۰ نئے موسموں کا پتہ (ہندو ایڈیٹر سیفی سیفی لائبریری سرونج ایم. پی.
پاک کے شاعر اور سرونجی
نقادوں کے مضامین)

| | | | |
|---|---|---|---|
| ۲۱ | اجنبی پیڑوں کے سائے۔ بشیر بدر | ڈاکٹر راحت بدر | آہ پبلیکیشن بدھوارہ بھوپال |
| ۲۲ | اشعار۔ڈاکٹر بشیر بدر | انتخاب۔ڈاکٹر راحت بدر | گوتم انٹر پرائزیز، بھوپال |

## ھندی رسم الخط

| | | | |
|---|---|---|---|
| ۱ | نئی غزل کا ایک نام۔بشیر بدر | ندا فاضلی | وانی پرکاشن، دریا گنج، دہلی ۱۹۹۷ء، ۲۰۰۶ء |
| ۲ | بشیر بدر | کنہیالال نندن | راج پال، دریا گنج دہلی (۲۰۰۴ء) |
| ۳ | اجالے اپنی یادوں کے۔ بشیر بدر | ونیت پاٹھک (مرحوم) | کشور گنج، جبلپور (۱۹۹۰ء) |
| ۴ | دھوپ کا چہرہ | سریش کمار | چنڈی گڑھ (۲۰۰۶ء) |
| ۵ | آس | بشیر بدر | وانی پرکاشن، دریا گنج دہلی (۲۰۰۲ء، ۲۰۰۴ء) |
| ۶ | اللہ خافظ۔بشیر بدر | پردیپ ساحل | وانی پرکاشن دریا گنج دہلی ۲۰۰۱ء |
| ۷ | افیکشن۔بشیر بدر | آلوک شریواستو | رام کرشن پرکاشن، ودیشہ (۲۰۰۱ء) |
| ۸ | اجالے اپنی یادوں کے۔ بشیر بدر، | وجے واتے | وانی پرکاشن، دریا گنج، دہلی (۲۰۰۳ء، ۲۰۰۴ء، ۲۰۰۷ء) |

| | | | |
|---|---|---|---|
| ۹ | تمہارے لئے | بشیر بدر | آلوک پرکاشن، ابوہر |
| ۱۰ | اجالوں کی پریاں | سریش کمار | ڈائمنڈ پاکٹ بکس، نئی دہلی، (۲۰۰۶ء) |
| ۱۱ | آنچ (بشیر بدر کی غزل) | مادھو شکلا موج | رام کرشن پرکاشن، ودیشہ (۱۹۹۷ء) |
| ۱۲ | دھوپ کی پتیاں اور ہرا ربن | بشیر بدر | انکر پرکاشن دہلی |
| ۱۳ | بشیر بدر | ندا فاضلی | وانی پرکاشن، دریا گنج، دہلی |
| ۱۴ | روشنی کے گھروندے۔ بشیر بدر | سریش کمار | ڈائمنڈ بکس، دہلی |
| ۱۵ | کلچر یکساں۔ بشیر بدر | بسنت پرتاپ سنگھ (سینئر آئی. اے. ایس) | وانی پرکاشن، دریا گنج، دہلی (۲۰۰۷ء، ۲۰۰۲ء، ۲۰۰۱ء) |
| ۱۶ | دھوپ کی پتیاں ہرا ربن | ڈاکٹر بشیر بدر | سادھنا پاکٹ، دہلی |
| ۱۷ | غزل یونیورس (ہندی، اردو اور انگریزی رسم الخط میں اشعار) | ڈاکٹر بشیر بدر | پرینکا آفسٹ، مہارانہ پرتاپ نگر، بھوپال (۲۰۰۳ء) |
| ۱۸ | اتھینٹک ڈریم (اردو، ہندی انگریزی رسم الخط میں اشعار) | ڈاکٹر بشیر بدر | پہلا پہل پرنٹرس ای پی نگر بھوپال (۲۰۰۴ء) |
| ۱۹ | ڈاکٹر بشیر بدر کی شاعری | انجم بارہ بنکوی | انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی (۲۰۰۵ء) |

۲۰ نئے موسموں کا پتہ۔ پردیپ ساحل وانی پرکاشن، دریا گنج دہلی (۲۰۰۱)
(ہندی رسم الخط)

۲۱ آئی لو یو مائی بھارت بشیر بدر وانی پرکاشن دہلی ۲۰۰۱ء
(قومی ترانے)

## گجراتی رسم الخط میں

۱ بشیر بدر۔ اردو سخنور شیرینی ندا فاضلی بمبئی آر. آر. سیٹھ اینڈ کمپنی ممبئی (۱۹۹۴ء)

۲ بشیر بدر ندا فاضلی پستک سینٹر، ممبئی

## پنجابی رسم الخط میں

۱ چونوی غزلیں۔ بشیر بدر ڈاکٹر جسوندر سونی سینگ وہار لین۔۵، جالندھر (۲۰۰۶ء)

## بشیر بدر کے فن اور شخصیت پر نثری تصانیف

۱ گوشہ بشیر بدر ماہ نامہ شاعر ممبئی

۲ انتساب۔ (بشیر بدر نمبر) سیفی سرونجی، سرونج

۳ سہ ماہی لمحے لمحے بدایوں
(بشیر بدر پر گوشہ)

۴ سہ ماہی فکر و آگہی مرتبین : ڈاکٹر باب العلم پبلیکیشن نوائڈا، یو پی
(بشیر بدر نمبر) رفعت سلطان،
ڈاکٹر رضیہ حامد

| | | | |
|---|---|---|---|
| ۵ | بشیر بدر فن اور شخصیت | مرتبین: ڈاکٹر رفعت سلطان، ڈاکٹر رضیہ حامد | باب العلم پبلیکیشن نوائڈا، یوپی |
| ۶ | بشیر بدر۔ نئی آواز | ڈاکٹر رفعت سلطان | باب العلم پبلیکیشن نوائڈا، یوپی |
| ۷ | جشن بشیر بدر نمبر | | دوبئی انٹرنیشنل دوبئی |
| ۸ | بیسویں صدی میں اردو غزل (حالی سے ۱۹۴۷ء تک) | بشیر بدر | پبلشر۔ بشیر بدر |
| ۹ | آزادی کے بعد اردو غزل کا تنقیدی مطالعہ (پی.ایچ.ڈی. مقالہ بشیر بدر ۱۹۷۱ء) | | پبلشر انجمن ترقی اردو دہلی (۲۰۰۱ء) |

## بشیر بدر کے اعزازات

۱۔ پدم شری ۱۹۹۹ء حکومت ہند

۲۔ پوئٹ آف داایئر ایوارڈ ۱۹۸۹ء نیویارک، امریکہ

۳۔ میر تقی میر کل ہند ایوارڈ ۱۹۹۷ء، مدھیہ پردیش اردو اکادمی، بھوپال (ایم. پی.

۴۔ اتر پردیش اردو اکادمی ایوارڈ ۱۹۶۹ء

۵۔ ''امتیاز میر'' میر تقی میر اکاڈمی، لکھنؤ

۶۔ بہار اردو اکادیمی پٹنہ ۱۹۸۶ء

۷۔ امیر خسرو ایوارڈ، دہلی ۲۰۰۰ء

۸۔ اختر الایمان ایوارڈ دہلی، ۲۰۰۰ء

۹۔ چراغ حسن حسرت ایوارڈ (جموکشمیر ۲۰۰۰ء)

۱۰۔ ساہتیہ اکادمی ایوارڈ، دہلی ۱۹۹۹ء

۱۱۔ جشن بشیر بدر ایوارڈ دوبئی۔ ۲۰۰۰ء (مجلس فروغ اردو ادب دبئی/ دوحہ)

**فرائض :-**

☆ لکچرر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ (ابتدائی چند سال)

☆ صدر بورڈ آف اسٹڈیز رسرچ ڈگری کمیٹی، میرٹھ

☆ صدر شعبہ اردو میرٹھ کالج، میرٹھ

☆ رکن مدھیہ پردیش اردو اکادیمی، بھوپال

☆ ممبر ساہتیہ اکادیمی، ہند۔ دہلی

☆ رکن مجلس انتظامیہ ترقی اردو بورڈ (مرکزی حکومت ہند) دہلی

☆ اکسپرٹ انعامی کمیٹی، ہماچل پردیش اکادیمی

☆ ممبر بورڈ آف اسٹڈیز کروکشیتر یونیورسٹی

☆ ممبر بورڈ آف اسٹڈیز اینڈ ایکزیکیٹو کمیٹی (گورنر نامنی) برکت اللہ یونیورسٹی، بھوپال

☆ چیئرمین مدھیہ پردیش اردو اکادیمی، بھوپال ۲۰۰۵ء سے ہیں۔

# شہر یار

پیدائش: ۱۶/ جون ۱۹۳۶ء

شہر یار کا اصلی نام کنور اخلاق محمد خاں ہے۔ ان کی پیدائش ۱۶/ جون ۱۹۳۶ء آنولہ (بریلی) میں ہوئی۔ شہر یار ان کا ادبی نام اور تخلص ہے۔

ہندوستان کے جدید شاعروں میں شہر یار ایسے شاعر ہیں، جو قدیم لفظیات کے ساتھ نئے موضوعات اور آج کی نئی نئی باتوں کو شاعری میں ڈھالنے کا ہنر جانتے ہیں۔ اسی لئے ان کے یہاں آج کے دور کے ایسے منظر نامے ملتے ہیں جو جدید عہد کی تصویریں ہیں۔ وہ غزل کی لفظیات میں آج کے حالات کو بڑی خوبصورتی سے پیش کرتے ہیں اور بہت آسانی سے آج کے داخلی مزاج کو بیان کر جاتے ہیں۔ ان کا لہجہ پُر اثر اور موضوعات نئے ہیں۔

اس حادثے کو سُن کر کرے گا کوئی یقیں
سورج کو ایک جھونکا ہوا کا بجھا گیا
کیوں آج اس کا ذکر مجھے خوش نہ کر سکا
کیوں آج اس کا نام مرا دل دکھا گیا

☆

سائے پھر سائے ہیں ڈھل جائیں گے یہ سورج کے ساتھ
یہ حقیقت تلخ ہے لیکن اسے سمجھو ذرا

☆

سب کچھ بدل گیا ہے مگر لوگ ہیں بضد
مہتاب ہی میں صورتِ جاناں دکھائی دے

☆

آؤ ہوا کے ہاتھ کی تلوار چوم لیں
اب بزدلوں کی فوج سے لڑنا فضول ہے

شہریار نے غزل کے ساتھ مختصر نظمیں بھی لکھی ہیں۔ ان کے مجموعۂ کلام ''اسم اعظم'' (۱۹۶۵ء) ساتواں در (۱۹۷۰ء) اور ''ہجر کے موسم'' (۱۹۷۸ء) ''شام ہونے والی ہے'' کافی اہم ہیں۔ ان میں غزل اور نظم دونوں شامل ہیں۔

غزل میں شہریار دل اور دماغ کی داخلی کیفیت کو اشارہ میں بیان کرتے ہیں، یہ کوئی آسان فن نہیں ہے۔ اسی لئے ادبی تذکروں میں ان کی غزل کا ذکر ضرور ہوتا ہے۔

شہریار کی شاعری میں آج کے ماحول کی دہشت اور خوف کا ذکر بھی ہے اور جدید افکار سے انھوں نے اپنی غزل کو سنوارا ہے۔ ان کی غزل میں وقت کے تیزی سے گزرنے کا شکوہ ہے۔ کبھی کبھی ایسا لگتا ہے جیسے شاعر کو نہ اپنے اوپر یقین ہے نہ دوسروں پر اعتبار ہے۔ عشقیہ اظہار جن اشعار میں کیا گیا ہے اس میں غزل کی روایت کو قائم رکھا ہے خوش آہنگی اور بیان میں نرمی کے اوصاف بخوبی ملتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

عجیب چیز ہے یہ وقت جس کو کہتے ہیں
کہ آنے پاتا نہیں اور بیت جاتا ہے

☆

لوگ سر پھوڑ کر بھی دیکھ چکے
غم کی دیوار ٹوٹتی ہی نہیں

☆

ہمیں تو اپنے دل کی دھڑکنوں پہ بھی یقین نہیں
خوشا وہ لوگ جن کو دوسروں پہ اعتبار ہے

☆

یا تیرے علاوہ بھی کسی شے کی طلب ہے
یا اپنی محبت پہ بھروسا نہیں ہم کو

☆

عجیب سانحہ مجھ پر گزر گیا یارو
میں اپنے سائے سے کل رات ڈر گیا یارو

☆

جب بھی ملتی ہے مجھے اجنبی لگتی کیوں ہے
زندگی روز نئے رنگ بدلتی کیوں ہے

☆

چاہا تھا تجھ کو تیرے تغافل کے باوجود
اے زندگی تو یاد کرے گی کبھی ہمیں

☆

لڑیں غموں کے اندھیرے سے کس کی خاطر ہم
کوئی کرن بھی تو اس دل میں ضوفشاں نہ رہی

شہریار کی غزل میں جدید رجحانات پائے جاتے ہیں۔ خوشگوار لب ولہجہ ہے۔ غزل کی سادگی میں ابلاغ پسندی پائی جاتی ہے۔

شہریار علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے تقریباً تیس سال جڑے رہے۔ وہاں ایم اے کے نصاب میں بھی شامل رہے۔ کئی سال ممبئی میں بھی مقیم رہے اور کئی فلموں کے لئے گانے بھی لکھے۔ ان کی غزلیں فلموں میں بہت مشہور ہوئیں مثلاً:

سینے میں جلن آنکھوں میں طوفان سا کیوں ہے
اس شہر میں ہر شخص پریشان سا کیوں ہے

☆

جستجو جس کی تھی اس کو تو نہ پایا ہم نے
اس بہانے سے مگر دیکھ لی دنیا ہم نے

شہریار جب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی ملازمت سے سبکدوش ہوئے تو علی گڑھ میں ہی سکونت اختیار کرلی۔ شہریار کی غزل میں زندگی کی نوعیت تعمیری قسم کی ہے۔ چنانچہ ان کے یہاں توڑنے کے بجائے جوڑنے کا عمل زیادہ نمایاں ہے۔ اپنی غزل میں انہوں نے سنگین حقیقتوں کو رنگین بنا کر انسان کو باہمت بنانے کی کوشش کی ہے۔ چند اشعار پیش ہیں۔

لاکھ خورشید سرِبام اگر ہیں تو رہیں
ہم کوئی موم نہیں ہیں کہ پگھل جائیں گے

☆

دوستوں کیوں ہو اس سے خوف زدہ
زندگی ہے کوئی بلا تو نہیں

☆

پہلے تھا جو بھی، آج مگر کاروبارِ عشق
دنیا کے کاروبار سے ملتا ہوا سا ہے

☆

دریا چڑھتے ہیں اُتر جاتے ہیں
حادثے سارے گزر جاتے ہیں

"جدید اردو غزل ۱۹۴۰ء کے بعد" کتاب میں جو خدا بخش لائبریری پٹنہ نے شائع کی ہے شمس الرحمٰن فاروقی نے ایک انتخاب بھیجا جس میں شہریار کے یہ شعر شامل ہیں۔

بھٹک رہی تھی جو کشتی وہ غرق آب ہوئی
چڑھا ہوا تھا جو دریا اُتر گیا یارو

☆

یہ اک شجر کہ جس میں نہ کانٹا نہ پھول ہے
سائے میں اس کے بیٹھ کے رونا فضول ہے

☆

وہ وصل کا دن کیوں چھوٹا تھا
یہ ہجر کی رات بڑی کیوں ہے

☆

زمیں نے ہم کو بہت دیر سے قبول کیا
جلی حروف میں یہ بات لکھے جاتے ہیں

شہر یار نے غزلیں کم لکھی ہیں پھر بھی چند ایسے خوبصورت شعر ضرور ان کے یہاں مل جاتے ہیں جن کو مقبولیت حاصل ہے۔

شدید پیاس تھی پھر بھی چھوا نہ پانی کو
میں دیکھتا رہا دریا تیری روانی کو
جو چاہتا ہے کہ اقبال ہو بلند تیرا
تو سب میں بانٹ برابر سے شادمانی کو

# ظفر اقبال

پیدائش ۱۹۴۰ء

ظفر اقبال جدید اردو غزل کے شاعر مانے جاتے ہیں۔ جدید اردو غزل کی دنیا میں یہ ایسا نام ہیں جس نے غزل کی روایت کا پورا احترام کرتے ہوئے نئی غزل کو نئے مزاج، نئی معنویت اور نئی لفظیات سے وابستہ کیا لیکن یہ بات غور طلب ہے کہ ظفر اقبال جیسے اچھے اور فطری غزل گو شاعر نے جدیدیت کے نشے میں چند شعر غزل کے معیار کے بہت کم درجے پر کہہ دئے ہیں۔ ان سے قطع نظر ان کے یہاں اچھے اشعار کی بھی کمی نہیں ہے۔ بلا شبہ وہ جدید غزل کے ایک منفرد شاعر ہیں۔ غزل کا شاعر اپنے اندرونی جذبوں کو تخیل کی زبان میں بیان کرنے کے لئے موزوں لفظ تلاش کرتا رہتا ہے۔ کسی شاعر کی عظمت کا اندازہ اس کے استعاروں کی قوت، تازگی اور بلندی سے کیا جا سکتا ہے جو معنی اور بیان سے شعر کی جان ہو جاتے ہیں۔ یہاں ظفر اقبال کے چند شعر پیش ہیں:

میں بکھر جاؤں گا زنجیر کی کڑیوں کی طرح
اور اس دشت میں رہ جائے گی جھنکار مری

☆

کس نے دروازوں کے شیشوں پر سیاہی پھیر دی
دیکھ بیٹھے تھے کبھی کس ماہ پیکر کی طرف

☆

کس نے پیشانی خاک کو زرد پتوں کے جھومر دیئے
کس کی درشنی موہ سے خشک جنگل ہرے ہو گئے

☆

وہ چہرہ ہاتھ میں لیکر کتاب کی صورت
ہر ایک لفظ ہر اک نقش کی ادا دیکھوں

☆

ہوا کی سخت فصیلیں کھڑی ہیں چاروں طرف
نہیں یہاں سے کوئی راستہ نکلنے کا

☆

وہ رنگ ہے کہ بکھرنے کی آرزو تھی اسے
میں سنگ ہوں کہ مجھے شوق ہے پگھلنے کا

☆

رو میں آئے تو وہ خود گرمی بازار ہوئے
ہم جنہیں ہاتھ لگا کر بھی گنہ گار ہوئے

☆

آگے بھی عشق میں ہوئیں رسوائیاں مگر
اب کے وفا کا زخم جبیں پر لگا مجھے

☆

خالی پڑی ہیں بید کی بیمار کرسیاں
خاکستری میں دھند برستی ہے لان پر

☆

لوگ ہی آج کے یک جا مجھے کرتے ہیں کہ میں
ریت کی طرح بکھر جاتا ہوں تنہائی میں

ظفر اقبال کے لئے اپنے مضمون ''پاکستانی غزل'' ۱۹۴۷-۱۹۸۱ء میں رشید امجد نے لکھا ہے:

''ظفر اقبال کے یہاں ذات کے حوالہ سے چیزوں کو دیکھنے کا رجحان غالب ہے۔ ذات کے حوالہ سے شاعری پہلے بھی ہو چکی ہے۔ غالبؔ اور دوسرے کئی شعراء کے یہاں اِکا دُکا شعر مل جاتے ہیں لیکن ظفر اقبال نے اسے تحریک کی صورت میں پیش کیا ہے چنانچہ ان کے یہاں ذات کے حوالے سے اشیاء کو دیکھنے کا عمل اور پھر اس کا ردّعمل نامیاتی وحدت کے ساتھ سامنے آتا ہے۔ ظفر اقبال کے یہاں ذات دوسری شخصیت کے روپ میں پہلی شخصیت پر حملہ آور ہوتی ہے۔ یہی تصادم ان کے یہاں بار بار مختلف رنگوں اور زاویوں سے پیکری قالب اختیار کرتا ہے۔''

(جدید اردو غزل ۱۹۴۰ء کے بعد)

ظفر اقبال کے اشعار کا منفرد انداز اور لہجہ ان اشعار کو پڑھ کر لگایا جا سکتا ہے۔

میں بھی شریک مرگ ہوں مر میرے سامنے
میری صدا کے پھول بکھر میرے سامنے

☆

سینے کا بوجھ اشکوں میں ڈھلتے ہوئے بھی دیکھ
پتھر کو موجِ خوں میں پگھلتے ہوئے بھی دیکھ
کب تک پھرے گا شہر میں پرچھائیوں کے ساتھ
سورج کو اس گلی سے نکلتے ہوئے بھی دیکھ

☆

ان کے ہر طرزِ تغافل پہ نظر رکھتی ہے
آنکھ ہے دل تو نہیں، ساری خبر رکھتی ہے

☆

وہ مجھ سے اپنا پتہ پوچھنے کو آنکلے
کہ جن سے میں نے خود اپنا سراغ پایا تھا

☆

ملا تو منزلِ جاں میں اُتارنے نہ دیا
وہ کھو گیا تو کسی نے پکارنے نہ دیا

☆

کوئی صدا مرے صبر و سکوت سے نہ اٹھی
کوئی مزا تیرے قول و قرار نے نہ دیا

☆

ایک جھونکے سے لرز جاتی ہے بنیاد مری
کون سی شاخ پہ تو نے کیا تعمیر مجھے

ظفر اقبال کے یہاں رہ رہ کر وہ گرم گفتاری دوستانہ ہی سہی لیکن طنز و مزاح میں بدل جاتی ہے جس کی گنجائش دو مصرعوں کی تہذیب میں ممکن نہیں ہے۔ غزل کا حرف صدیوں کی تہذیب کا اظہار ہے۔ ظفر اقبال کے مندرجہ ذیل اشعار اس بات کا نمونہ ہیں کہ زندگی سے آپ جیسی بھی تنقیدی گفتگو کریں لیکن تہذیب غزل چھوڑنے کے بعد غزل، غزل نہیں رہتی۔ ظفر اقبال کے یہ اشعار غزل کے خوبصورت اشعار کہلانے کے مستحق نہیں ہیں:

واپس آنے کی راہ کوئی نہیں
جاتی ہے شہر کو یہ پگ ڈنڈی

☆

رشتوں سے بنے ہوئے مکان پر
لکھوا ہٰذا مِن فضلِ ربّی
پلّے ہی ظفر ہیں اس طرح کے
کتیا تو نہیں تھی ڈب کھڑبّی

☆

بور ہوتے ہیں پاس والے سے
جو ذرا دور ہے اسے تانکیں

☆

کچھ نایاب ہیں بوسے
کچھ مہنگی ہے شکر
چھاتی سے بھی لگایا
گئی نہ اس کی اکڑ

☆

مُندری تو چرا کے لے گئے چور
خالم خالی پڑی ہے ڈبّی

☆

کون لیتا ہے سکھ کی سانس یہاں
کس کی بیوی نہیں ہے جھگڑالو

☆

چپ بھی رہتے ہو اور زندہ ہو
یہ بات ہے اور بھی اچنبھا

ظفر اقبال کی یہ غیر سنجیدہ شاعری ان کے ذہن و دل کی وقتی ضرورت تھی جب شاعر کوئی نئی بات پیدا کرنا چاہتا ہے لیکن حدودِ غزل اور تہذیب غزل سے نکل کر جو شاعری کی جائے گی وہ صرف وقت کی بربادی کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ یہ بات ظفر اقبال کو بھی سمجھ میں آ گئی ہوگی کیوں کہ ان میں اس طرح کے غیر مہذب اشعار کو مضامین میں کوٹ کرنا بہت دشوار عمل ہے۔ ہر دور کے ادب کا اپنے سماج سے ایک مضبوط رشتہ ہوتا ہے۔ یہی رشتہ ادب اور شاعری کو بقاء دیتا ہے۔ ظفر اقبال کے یہاں غزل کی تہذیب کی

ڈور کمزور پڑگئی تھی۔ اسی لئے ان کی شاعری کا کچھ حصہ بہت کمزور ہوگیا۔ ان کی اس طرح کی شاعری نے اپنی اہمیت اور افادیت کو کھو دیا اور وہ صحیح معنوں میں مزاحیہ شاعری بھی نہیں بن پائی۔ وقت اور حالات کے ساتھ غزل کے انداز بدلتے رہے ہیں لیکن اس کی غزلیہ خوبیاں اور تقاضوں کو شاعر نے نہیں چھوڑا۔ ظفر اقبال نے جہاں ان تقاضوں کو چھوڑا وہاں ان کی شاعری کمزور ہوگئی۔ سنجیدگی ختم ہوگئی اور مزاح بھی پیدا نہیں ہوسکا۔ ظفر اقبال زندگی کی جدو جہد کے روشن پہلوؤں تک رسائی حاصل نہیں کر سکے جبکہ ان کے اندر یہ فطری سلیقہ موجود تھا۔

## محمد علوی

پیدائش : ۱۹۳۸ء

محمد علوی احمد آباد میں رہتے ہیں ان کی پیدائش ۱۹۳۸ء میں ہوئی۔ ان کی غزلوں کا پہلا مجموعہ "خالی مکان" ۱۹۶۳ء میں آیا تھا۔ خالی مکان کا دیباچہ محمود ایاز نے لکھا تھا جس میں وہ تحریر کرتے ہیں:

> "مجھے خوشی ہے کہ علوی اپنی حدود سے اچھی طرح واقف ہیں اور ان حدود میں رہ کر انہوں نے جو شاعری کی ہے اس کا اپنا حسن اور تاثر دلکش بھی ہے اور خوشگوار بھی۔"

(خالی مکان صفحہ ۱۲)

ان کی غزلوں میں معصوم بچوں کا تحیّر ہے۔ یہ فن کچھ آسان نہیں ہے۔ نظم و غزل میں پرانے اسلوب کو اپنانا بھی وسعت مطالعہ اور فنی مہارت کا کام ہے لیکن اپنی بات کی آسان زبان میں معصوم تحیّر کے ساتھ کہہ جانا تہہ داری کے ہنر کو چھپا کے رکھنا اور

اس کا رفتہ رفتہ تہہ بہ تہہ کھولنا نیا اور مشکل انداز ہے۔ اس لحاظ سے علوی کی غزل ہماری روایتی اور قدیم غزل سے الگ نیا نیا سا مزاج رکھتی ہے اور ان کی غزلوں کو پرکھنے کے لئے نئے مزاج اور نئی تنقیدی تربیت لازمی ہے:

روز اچھے نہیں لگتے آنسو
خاص موقعوں پہ مزا دیتے ہیں
ہائے وہ لوگ جو دیکھے بھی نہیں
یاد آئیں تو رُلا دیتے ہیں

☆

یہ کون جھانکتا ہے کواڑوں کی اوٹ سے
بتی بجھا کے دیکھ سویرا نہ ہو کہیں

☆

پیڑ سے پیڑ لگا رہتا ہے
پیار ہوتا ہے بھرے جنگل میں

☆

کسی جنگل میں کیوں جاتا نہیں ہے
ارے یہ پیڑ کیوں تنہا کھڑا ہے

☆

رات ساحل پہ کھڑی روتی ہے
چاند اترا ہے بھرے دریا میں

☆

اک پرندہ سنا رہا تھا غزل
چار چھ پیڑ مل کے سنتے تھے

محمد علوی کی شاعری احساس کی شاعری ہے۔اپنے مشاہدات کو بھی انہوں نے غزل میں بہت خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

لمبی سڑک پہ دور تلک کوئی بھی نہ تھا
پلکیں جھپک رہا تھا دریچہ کھلا ہوا

☆

کتاب کھولوں تو حرفوں میں کھلبلی مچ جائے
قلم اٹھاؤں تو کاغذ کو پھیلتا دیکھوں

بلا شبہ محمد علوی کے یہاں جدیدیت ہے۔اس جدیدیت میں کئی اور شاعروں کی طرح انہوں نے کلاسیکل شاعری سے زیادہ فائدہ نہیں اٹھایا۔شاید اسی وجہ سے محمد علوی کو احمد فراز وغیرہ کی طرح عوامی شہرت نہیں ملی لیکن ان رسائل میں جیسے شب خون الہ باد جس کے ایڈیٹر مشہور نقاد شمس الرحمٰن فاروقی تھے اس میں محمد علوی کو بہت اہمیت دی گئی تھی۔جدید شاعری میں ان کی بہت اہمیت ہونے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ تازہ کار غزل کے علاوہ ان کی مختصر نظمیں واقعی سب سے الگ اردو میں پہلی بار نظر آئیں تھیں۔محمد علوی کا اثر کئی شعراء نے قبول کیا جن میں عادل منصوری بھی تھے۔محمد علوی کی غزل میں معصومیت، اللڑھ پن اور شوخی اکثر اشعار میں نظر آجاتی ہے:

وہ میرے ساتھ جانے پہ تیار ہوگیا
سوتے سے ہڑبڑا کے میں بیدار ہوگیا

☆

لڑکیوں سے گلیارے
کھڑکیوں سے گھر روشن

☆

گلدان میں گلاب کی کلیاں مہک اٹھیں
کرسی نے اس کو دیکھ کے آغوش وا کیا

☆

بلا رہا تھا کوئی چیخ چیخ کر مجھ کو
کنوئیں میں جھانک کے دیکھا تو میں ہی اندر تھا

☆

وہ جنگلوں میں درختوں پہ کودتے پھرنا
برا بہت تھا مگر آج سے تو بہتر تھا

☆

سڑک پر چلتے پھرتے دوڑتے لوگوں سے گھبرا کر
کسی چھت پر مزے سے بیٹھے بندر دیکھ لیتا ہوں

محمد علوی کی کتاب خالی مکان کے فلیپ پر جن مشہور ادیبوں نے اپنی رائے دی اور کلام پر تنقیدی جملے لکھے وہ پیش ہیں:

ناصر کاظمی محمد علوی کے بارے میں اپنی رائے لکھتے ہیں:

''آپ کی غزلوں میں ایک میٹھا میٹھا رس ہے۔ جو کچھ دنوں بعد ضرور رنگ لائے گا۔''

گوپال متل فرماتے ہیں :

''آپ نے نظم کے علاوہ غزل میں بھی ایک خاص اسلوب پیدا کیا ہے جو واقعی قابل داد ہے۔''

ظ. انصاری کا کہنا ہے :

''تمھیں غزل کہنے کا سلیقہ کہاں سے آیا؟ گجرات میں رہنا احمد آباد میں گھومنا جہاں سارے بازار میں اردو کا بورڈ نہیں ہے اور ایسی اہل زبان کی سی جدید غزل کہنا یوں نکتے پیدا کرنا۔

بڑا جی خوش ہوا۔

علوی، کمال کرتے ہو بھئی۔ احمد آباد میں الگ تھلگ رہ کر جدّتِ طبع کو برقرار رکھے ہوئے ہو۔''

محمد علوی احساس کے شاعر ہیں۔ ان کے یہاں فکر اور جذبے کی شدّت بہت کم نظر آتی ہے۔ محمد علوی کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ ان کی غزلیں علی گڑھ یونیورسٹی کے ایم.اے. کے نصاب میں شامل ہیں جس کے متعلق رسالہ ''شب خون'' نومبر ۱۹۶۸ء صفحہ ۸۶ پر تحریر ہے۔

''۱۔ یگانہ فراق کے بعد غزل نیا عنصر نیا لہجہ۔

۲۔ غزل کی نئی علامتیں اور نئے لفظی تلازمے۔

ناصر کاظمی، سلیم احمد، احمد مشتاق، ظفر اقبال، شکیب جلالی، شہزاد احمد، احمد فراز، شہریار، بمل کرشن اشک، محمد علوی، بشیر بدر، ساقی فاروقی وغیرہ۔''

بے شک اس وقت کے لحاظ سے ان تمام اہم شعراء کی شاعری میں ایک نیا اسلوب رنگ و آہنگ تھا۔ کلاسیکل لفظیات، نئی اختراعی تراکیب کا استعمال، تشبیہات اور

استعاروں کا استعمال اپنے انداز اور اپنی ضرورت کے مطابق کیا تھا یہاں مثال کے طور پر چند مصرعے دیئے جا رہے ہیں۔

☆ راہیں تھکی تھکی سی ہیں

☆ آنکھیں بجھی بجھی سی ہیں

☆ سردی سے مرجھائے بدن کھل اٹھتے ہیں

☆ سورج سے جل اٹھا ہے ورق آسمان کا

☆ یہ کون جھانکتا ہے کواڑوں کی اوٹ سے

☆ یہ انھیں کا سنگ در ہے سورہو

☆ لوگ کہتے ہیں یہاں لال پری رہتی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

## شعری بھوپالی

پیدائش: ۱۹۰۲ء          وفات: ۹ جولائی ۱۹۹۱ء

شعری بھوپالی کا اصل نام محمد اصغر تھا اور شعریؔ تخلص تھا۔ وہ اس عہد کے کلاسیکل غزل کا ایک ایسا نام تھے جو ادبی محفلوں کے ساتھ مشاعروں کی بھی زینت تھے۔ ان کے غزلیہ کلام میں ہماری قدیم غزل کی اکثر خوبیاں مل جاتی ہیں۔ مشاعروں میں مقبول ہونے کا سبب ان کا منفرد پڑنے کا انداز تھا۔ وہ اپنے عہد کے ہر دلعزیز شاعر تھے۔ ان کی غزل کے چند اشعار پیش ہیں جن سے ان کے لہجے، آہنگ اور انداز کا پتہ چلتا ہے—

چوٹ کھایا ہوا زمانے کا
میں قفس کا نہ آشیانے کا

☆

وہاں بھی ان کو بجز خاک اور کچھ نہ ملا

زمیں پہ رہ کے جو مرتے تھے آسماں کے لئے

☆

اپنے دل کی سادگی پر رحم آتا ہے مجھے

مسکرا کر بات کی جس نے اسی کا ہوگیا

☆

محبت معنی و الفاظ میں لائی نہیں جاتی

یہ وہ نازک حقیقت ہے جو سمجھائی نہیں جاتی

شعری بھوپالی فارسی تراکیب کا بہت کم استعمال کرتے تھے۔ حسن وعشق ان کی شاعری میں مرکزی حیثیت رکھتے تھے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

یاد محبوب جا خدا حافظ

تو بھی اپنی نہیں پرائی ہے

☆

محبت سے شعریؔ وہ بیزار ہوکر

سراپا محبت بنے جا رہے ہیں

☆

بھٹکیں نہ میرے بعد کے آئے ہوئے راہی

ہر موڑ پہ منزل کا نشاں چھوڑ دیا ہے

☆

دل سا ہوگا نہ عالی ظرف کوئی
ٹوٹ کر بھی صدا نہیں دیتا

☆

دنیا میں ہی دنیا کی سزا دے یا رب
مجھ سے تو تیرے سامنے آیا نہیں جاتا

☆

اپنی بربادی پہ خوش ہوں یہ سنا ہے جب سے
وہ جسے اپنا سمجھتے ہیں مٹا دیتے ہیں

☆

خود ہی مٹ جائیں کیوں نہ ہم شعریؔ
کون احسان لے زمانے کا

☆

بس اب انتہا ہو چکی ضبط غم کی
کہ رونے کو جی چاہے اور مسکرائیں

شعری بھوپالی ۱۹۰۲ء میں اکبر آباد، آگرہ (یوپی) میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کا شعری لہجہ پرانی خوب صورت روایتوں سے سجا ہوتا تھا۔ ان کا مخصوص اور پسندیدہ لباس تنگ مہری کا چوڑی دار پاجامہ، کالی شیروانی اور کالی مخمل کی ٹوپی تھا۔ وہ بلا شبہ اپنے زمانے کے بہت مقبول شاعر تھے۔ ان کی شہرت ہندوستان گیر شہرت تھی۔ ان کے کئی مجموعے منظر

عام پر آئے مثلاً ''فریادِ وطن''، ''شاعر کا پیغام''، ''صحیح غزل''، ''آتش دل''، ''آہ وہ نغمہ''، ''فردوسِ غزل'' اور ''شانِ غزل''۔

شعریؔ صاحب نے فلم جگنو، آخری پیغام اور کیپٹن آزاد وغیرہ کے لئے بھی غزلیں لکھیں۔ ان کو کئی اعزاز بھی ملے۔ مثلاً طبیہ کالج دہلی سے گولڈن میڈل، مدھیہ پردیش اردو اکادمی سے ''سراج میر خاں سحر'' ایوارڈ وغیرہ۔ شعریؔ بھوپالی کا طویل علالت کے بعد ۸۹ سال کی عمر میں ۹ جولائی ۱۹۹۱ء کو جے پرکاش نرائن اسپتال بھوپال میں انتقال ہوگیا۔

شعری بھوپالی کو اپنے اسلوب اور آہنگ کے اعتبار سے جگر مرادآبادی کا شاگرد کہا جاتا ہے۔ جگر صاحب شعری بھوپالی کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ شعری صاحب کی شاعری عشق محبت، وفا، بے وفائی، مشاہدات، نازک احساسات اور جذبات کا مجموعہ ہے۔ زبان اور بیان کی سادگی شعری بھوپالی کے کلام کا نمایاں وصف ہے۔ ان کی مشہور غزل ہے:

ہمیں تو شام غم میں کاٹنی ہے زندگی اپنی
جہاں وہ ہوں وہیں اے چاند لے جا چاندنی اپنی
اگر کچھ تھی تو بس یہ تھی تمنا آخری اپنی
کہ وہ ساحل پہ ہوتے اور کشتی ڈوبتی اپنی
خدا کے واسطے ظالم گھڑی بھر کے لئے آجا
بجھائی ہے تیرے دامن سے شمع زندگی اپنی
وہیں چلئے وہیں چلئے تقاضہ ہے محبت کا
وہ محفل ہائے جس محفل میں دنیا لٹ گئی اپنی

# محمد علی تاج

پیدائش: ۱۹۲۶ء　　　　وفات: ۱۹۷۸ء

محمد علی تاؔج اچھی صلاحیتوں کے ترقی پسند شاعر تھے۔ ان کے مجموعے کا نام ''خیمۂ گل'' ہے جس کا پیش لفظ جاں نثار اختر نے لکھا تھا۔

جاں نثار اختر اپنے پیش لفظ میں محمد علی تاج کے لئے لکھتے ہیں:

''تاج جو اپنے شہر بلکہ اپنے صوبے کا سب سے مقبول اور ہر دلعزیز شاعر ہے کل ہندوستان گیر شہرت کا مالک بنے گا۔''

(صفحہ ۱۰، خیمۂ گل)

اس میں شک نہیں کہ تاؔج غزل کے فطری شاعری تھے۔ اس زمانے میں غزل کے ساتھ ہر صنفِ سخن پر ترقی پسندی اور مارکسی نظریات چھائے ہوئے تھے۔ ان تحریکوں کے اثرات بھی ہر قابل ذکر شاعر کی غزلوں پر خوب پڑے۔ محمد علی تاؔج کا یہ شعر اس کی تائید کرتا ہے ۔ حالانکہ ایسے اشعار غزل کے معیار سے کم تر تھے۔

اس امن کی خاطر زیست کی خاطر سارا مشرق جاگ اٹھا ہے
لاکھوں کروڑوں ہاتھ اٹھے ہیں دلّی سے شنگھائی تک

انکی کتاب ''سورج نما'' میں جو غزلیں شامل ہیں اسے ہم بہت مختصر انتخاب کہہ سکتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تاؔج غزل اور نظم دونوں کے شاعر تھے لیکن ان کی مختصر غزلوں میں بھی ایسے احساس سے بھرپور شعروں کی کمی نہیں ہے، جو انہیں بھوپال ہی کے نہیں بلکہ ہندوستان کے اہم ترین شعراء میں ہمیشہ شامل رکھے گی۔

شمع دہلیز پہ روشن رکھو
کیا عجب ہے کہ وہ آ ہی جائے

☆

فراقِ یار کا عالم نہ پوچھو
کوئی جیسے کلیجہ چاٹتا ہے

☆

تم بھی ہلاکتوں کے سوا کچھ نہ پاؤ گے
یارو ہمیں کو دیکھ لو اک تجربہ ہیں ہم

☆

مجھے تقدیر نے سب کچھ دیا تھا
مگر سب کچھ برائے نام ٹھہرا

☆

درد سے چہرے کی تابانی بڑھی
گھر جلا تو آسماں روشن ہوا

☆

میں اکثر راستو میں سوچتا ہوں
یہ بستی کوئی جنگل تو نہیں ہے

اس ترقی پسند لہجے کے ساتھ ساتھ ان کے یہاں تغزل کا مخصوص لہجہ بھی نمایاں ہے:

ہم کو کسی سے کیا کہ تیرے آشنا ہیں ہم
تجھ سے بگڑ گئی ہے تو سب سے خفا ہیں ہم

☆

آنکھوں کی قید زلف کی زنجیر کی قسم
جب سے جواں ہوئے ہیں سراپا سزا ہیں ہم

☆

حصولِ گندم وجو اس قدر نہیں مشکل
یہ چند خواب ہمیں دربدر پھراتے ہیں

☆

نہ میں یُوسف نہ تم کوئی زلیخا
جہاں چاہو مجھے نیلام کردو

ان شعروں کے ساتھ ساتھ اشتراکیت پر یقین رکھنے میں ان کی سوچ میں انسانیت کی لے اور بڑھی تھی:

اپنے بارے میں صرف کیا سوچیں
سوچنا ہے سبھی کے بارے میں

☆

سکۂ محنت کے یہ دن ہیں
کفر نہ اب، اسلام چلے گا

اشتراکی مزاج کا یہ اجتماعی انداز یہاں ایک خوبصورت شعر بن گیا۔

الگ تھی تو قطرے سے کم تھی یہ ہستی
ملی ہے تو موجِ رواں بن گئی ہے

☆

بجھا گئی ہے اسے بھی اجل کی سرد ہوا
یہ کہہ کے گھر میں ترے کیوں چراغ جلتا ہے

محمد علی تاؔج نے کلاسیکل غزل کی تمام روائتوں کی پابندی کرتے ہوئے مارکسی ترقی پسند خیالات کو غزل میں کامیابی کے ساتھ ڈھالا ہے۔ ان کے کئی شعر اپنے صوبے میں نہیں بلکہ ساری اردو دنیا میں پسند کئے گئے۔ تاج بھوپالی کے اکثر اشعار صاف، سادہ انداز اور حقیقت سے بہت قریب ہیں۔ چند شعر ملاحظہ کیجئے:

پیچھے بندھے ہیں ہاتھ مگر شرط ہے سفر
کس سے کہیں کہ پاؤں کے کانٹے نکال دے
میں تاج ہوں تو تو مجھے سر پر چڑھا کے دیکھ
یا اس قدر گرا کے زمانہ مثال دے

تاج بھوپالی کے یہاں ترقی پسندی کی ادبی مثالیں مل جاتی ہیں کیونکہ ان اشعار پر دوسرے کسی ترقی پسند شاعر کا سایہ نہیں ہے۔ یہ اشعار ان کی نئی تخلیق ہیں۔ حسن و عشق کا ان کا اپنا انداز تھا اور غزلیہ شعریت کی اچھی مثال ان کے اشعار میں موجود ہے، مثلاً:

یہ جو کچھ آج ہے کل تو نہیں ہے
یہ شامِ غم مسلسل تو نہیں ہے

میں لمحہ لمحہ مرتا جا رہا ہوں
مرا گھر میرا مقتل تو نہیں ہے

☆

مجھے انسان کے مرنے کا اتنا غم نہیں ہوتا
قلق ہوتا ہے جب انسان میں انسان مر جائے

☆

تم کو دیکھا تو یقیں ہوتا ہے
کوئی اتنا بھی حسیں ہوتا ہے

محمد علی تاج غزل کے صاحب طرز شاعر ہیں۔ ان کی غزل خوبصورت زبان اور خوبصورت اظہار کا نمونہ ہے، شعر دیکھئے:

وہ سامنے ہیں مگر منزلوں کی دوری ہے
غزل کے واسطے یہ فاصلہ ضروری ہے

☆

عمر بھر پڑھئے عمر بھر لکھئے
ہر زمانہ کتاب جیسا ہے

☆

انھیں اور ان کے ہی خط دیکھ ڈالیں
جنھیں دیکھا نہیں دو اک برس سے

محمد علی تاؔج کا مجموعہ کلام ''سورج نما'' ۱۹۸۱ء میں شائع ہوا۔ ڈاکٹر شمیم احمد اس کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں:

''اب اس کی موت (۱۲ اپریل ۱۹۷۸ء) کے تین سال بعد شعری مجموعہ جو خدا جانے کہاں کہاں بکھرا پڑا تھا، فضل تابش نے جمع کر کے شیرازہ بند کیا اور مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی نے بہ اہتمام شائع کرنے کا مستحسن قدم اٹھایا۔ اس کے لئے مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی قابل مبارک باد ہے۔''

(سورج نما صفحہ نمبر ۶)

محمد علی تاؔج غزل کے ایسے اچھے اور سچے شاعر ہیں جو اپنے دور میں کسی سے کم نہیں ہیں۔ شاید ہمارے اردو ادب کے بڑے بڑے نقادوں نے تاج بھوپالی پر نظر کرم کیا ہوتا تو کئی ایسے شعراء کی طرح جن کے پاس عوام کے لئے ایک شعر بھی نہیں ہے لیکن قسمت سے شہرت صرف نام کی پالی ہے (کام کی نہیں) تاج بھوپالی کے کلام میں کئی ایسے عالمی موضوع اور قابل تعریف اشعار مل جائیں گے جن کی وجہ سے وہ اپنے عہد میں کسی بھی ہندوستان کے بڑے غزل کے شاعر سے کم نہیں ہیں۔

تاؔج کے چند اشعار درج ذیل ہیں:

یہ تو انسانوں کے ٹوٹے ہوئے دل ہیں ساقی
ہم سے ٹوٹے ہوئے ساغر نہیں دیکھے جاتے

☆

میں اکثر راستوں میں سوچتا ہوں
یہ بستی تو کوئی جنگل نہیں ہے

محمد علی تاؔج کے صرف سماجی اور انقلابی شعر ہی بے مثال نہیں ہیں بلکہ تاج نے حسن و عشق کے دل کو چھوتے ہوئے جو غزل کے شعر کہے ہیں وہ بھی بے مثال ہیں۔

ملاحظہ ہوں:

جتنا کھلتا ہے رنگ کھلتا ہے
وہ سراپا گلاب جیسا ہے

☆

تمھیں کچھ بھی نہیں معلوم لوگو
فرشتوں کی طرح معصوم لوگو

☆

دست غربت میں تیرا نامہ شوق
ہاتھ میں پھول کھلا ہو جیسے

☆

دل کی باتیں کسی حسیں سے کہیں
پر کہیں بھی تو کس یقیں سے کہیں

☆

تاج صاحب بڑے اکڑتے تھے
آپ بھی چل پڑے بہاؤ کے ساتھ

☆

رات کیا بات تھی بن شب ماہ بھی
تم مرے گرد تھے چاندنی کی طرح

محمد علی تاجؔ کو اس بات کا خوب اندازہ تھا کہ غزل کی دنیا میں ان کا مقام ضرور بنے گا۔ اسی لئے کہتے ہیں:

تاجؔ خود جن کے انداز و اسلوب ہیں
وہ غزل کیوں کہیں گے کسی کی طرح

محمد علی تاجؔ غزل کے صفِ اوّل کے شاعر تو ہیں ہی لیکن وہ اس بات کے بھی مستحق ہیں کہ ان کو دنیائے ادب میں اعلیٰ مقام دیا جائے۔

## شکیب جلالی

پیدائش: ۱۹۳۴ء وفات: ۱۹۷۱ء

شکیب جلالی کا تعلق پاکستان سے ہے۔ ان کا شمار جدید غزل کے شاعروں میں کیا جاتا ہے۔ جدید غزل کی ابتداء ہوئی تو ہندوستان سے لیکر پاکستان کے ہر شاعر نے اس کی مشق اور تجربے اپنے اپنے انداز اور اپنے اپنے اسلوب میں خوب کئے۔ پاکستان میں جدید غزل کے تجربے ناصر کاظمی ظفر اقبال اور شکیب جلالی نے بھی کئے جبکہ ہندوستان میں یہ رجحان تقلید کی حد سے آگے نہ بڑھ سکا بلکہ اس عہد کے شمیم حنفی نے جدید غزل کو کلاسیکی روایت سے ہم آہنگ رکھنے کی قابل قدر کوشش کی ہے۔ جدّت کی کوشش شکیب جلالی کے اس شعر میں ملاحظہ ہو:

درخت راہ بتائیں ہلا ہلا کے ہاتھ
کہ قافلے سے مسافر بچھڑ گیا ہے کوئی

شکیب جلالی اس عہد کے نوجوان نسل کے اہم شاعر تھے۔ اگر عین عالم جوانی میں اس دنیا سے کوچ نہ کر گئے ہوتے تو آج بلا شبہ دنیائے غزل پر اپنے چند ہم عصروں کی طرح چھائے ہوئے ہوتے۔ ہندوستان میں ان کا کوئی مجموعہ دستیاب نہ ہو سکا۔ مختلف رسائل میں جو ان کے اشعار ملے اور اسلوب کے متعلق معلومات حاصل ہوئی اس کی روشنی میں ان کے کلام پر اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔

شکیب جلالی جدید ترین اردو شاعروں سے متاثر نظر آتے ہیں ان میں احمد ندیم قاسمی، فیض اور فراق ہیں۔ نقوش لاہور، فنون لاہور اور نیا دور کراچی جیسے مستند رسائل میں شکیب جلالی کا کلام خوب شائع ہوتا تھا۔ ان رسائل سے اشعار کا انتخاب پیش ہے۔ ان کے اشعار پر ہندوستان اور پاکستان کے تنقید نگاروں نے بھی تبصرہ کیا ہے۔ شعر ملاحظہ ہوں:

آ کے پتھر تو مرے صحن میں دو چار گرے
جتنے اس پیڑ کے پھل تھے پسِ دیور گرے
مجھے گرنا ہے تو میں اپنے ہی قدموں پہ گروں
جس طرح سایۂ دیوار پہ دیوار گرے
کیا کہوں دیدۂ تر یہ تو میرا چہرہ ہے
سنگ کٹ جاتے ہیں بارش کی جہاں دھار گرے

اب کون جائے کوئے ملامت کو چھوڑ کر
قدموں سے آ کے اپنا ہی سایہ لپٹ گیا

سوچو تو سلوٹوں سے بھری ہے تمام روح
دیکھو تو اک شکن بھی نہیں ہے لباس میں
وہاں کی روشنیوں نے بھی ظلم ڈھائے بہت
میں اس گلی میں اکیلا تھا اور سائے بہت

''پاکستانی غزل'' (۱۹۴۷۔۱۹۸۱) مطبوعہ ''جدید اردو غزل ۱۹۴۰ء کے بعد''
اس کتاب کی طباعت خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ نے ۱۹۹۵ء میں کی تھی۔ اس
کتاب کے صفحہ نمبر ۴۸ پر رشید امجد لکھتے ہیں:۔

''شکیب جلالی اپنے کینوس پر لہو رنگ تصویریں بتاتے ہیں۔ یہ
جذباتی پیکر قاری کو اپنی طرف متوجہ تو فوراً کر لیتے ہیں لیکن رفتہ رفتہ
ان میں فکری کمی کا احساس ابھرنے لگتا ہے۔ شکیب کے پیکر پہلی
نظر میں جتنے اچھے لگتے ہیں مفہوم کا ابلاغ ہونے کے بعد ان کا اثر
اسی حد تک سمٹنے لگتا ہے اور فطری اور محسوساتی دلکشی کے بعد فکری
حیثیت سے ان کے دائرے خاصے سمٹے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس
فکری کمی کو شکیب طنزیہ اور کربیہ لہجے سے پورا کرتے ہیں۔

ہر چند جل کے راکھ ہی ہونا ہے راہ میں
جلتے ہوئے پروں سے اُڑا ہوں مجھے بھی دیکھ

☆

کیا جانئے منزل ہے کہاں جاتے ہیں کس سمت
بھٹکی ہوئی اس بھیڑ میں سب سوچ رہے ہیں

ان پیکروں میں سارا زور لہجہ کے طنز پر ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ

فکری اعتبار سے شکیب جلالی کے یہاں زندگی کا کوئی نظریہ نہیں

ہے۔"

شکیب جلالی کے یہاں زندگی کو ہمت اور حوصلہ سے گزارنے اور مشکلات

سے مقابلہ کرنے کی طاقت کم ہے:

تو نے کہا نہ تھا کہ میں کشتی پہ بوجھ ہوں

چہرے کو اب نہ ڈھانپ مجھے ڈوبتے بھی دیکھ

پاکستان کے شکیب جلالی کم عمری کی وجہ سے غالباً وہاں کے ادبی مرکز سے بھی دور رہے۔ ان کی سوانح بھی کسی ادبی مرکز کے رسائل میں نظر نہیں آتی۔ شکیب جلالی نے بہ انداز غزل، جدید عہد کی تیز رفتار زندگی، خود میں کھوئی ہوئی بے خودی کا اظہار جس طرح کیا ہے اس سے شکیب اپنے ہم عصروں میں منفرد نظر آتے ہیں:

مثلاً:

آکر گرا تھا ایک پرندہ لہو میں تر

تصویر اپنی چھوڑ گیا ہے چٹان پر

ملبوس خوشنما ہیں مگر جسم کھوکھلے

چھلکے سجے ہوں جیسے پھلوں کی دکان پر

☆

یہ ایک ابر کا ٹکڑا کہاں کہاں برسے

تمام دشت ہی پیاسا دکھائی دیتا ہے

سمٹ کے رہ گئے آخر پہاڑ سے قد بھی

زمیں سے ہر کوئی اونچا دکھائی دیتا ہے

میرے خیال میں شکیب جلالی کے اِن شعروں کی شمولیت کے بغیر جدید غزل کا کوئی مضمون اور کوئی داستان مکمل نہیں ہو سکتی۔

اب تو انسان کی عظمت بھی کوئی چیز نہیں
لوگ پتھر کو خدا مان لیا کرتے تھے

وقت کی ڈور خدا جانے کہاں سے ٹوٹے
کس گھڑی سر پہ لٹکتی ہوئی تلوار گرے

(آزادی کے بعد اردو غزل کا تنقیدی مطالعہ، صفحہ ۱۸۳)

## ندا فاضلی

پیدائش: ۱۲؍اکتوبر ۱۹۳۸ء، مقام۔ گوالیار (ایم. پی.)

ندا فاضلی غزل نظم اور دوہوں کے شاعر ہیں۔ غزل اور نظم کے اچھے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ انہوں نے کئی فلموں میں گیت بھی لکھے ہیں۔ ندا فاضلی کے مجموعے جو بہت مقبول ہوئے ان کے نام ہیں: ''لفظوں کے پل''، ''مور ناتھ''، ''آنکھ اور خواب کے درمیان''، ''سویا ہوا سا کچھ''، ''شہر میرے ساتھ چل'' اور ''زندگی کی تڑپ''۔ ان مجموعوں میں ان کی غزلیں نظمیں اور دوہے ہیں۔ ندا فاضلی کو نثر لکھنے پر بھی عبور حاصل ہے۔ ان کی نثری کتابوں کے نام ہیں: ''دیواروں کے بیچ''، ''دیواروں کے باہر''، ''چہرے'' اور ''تماشہ میرے آگے''۔

ندا فاضلی ۱۲؍اکتوبر ۱۹۳۸ء کو گوالیار میں پیدا ہوئے۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد ممبئی میں قیام پزیر ہیں۔ نظم غزل دوہے یا نثری موضوع ہو ان کی تحریر پرکشش اور متوجہ کرنے والی ہوتی ہے۔ اکثر طنز و مزاح بھی اس میں شامل ہوتا ہے جو پڑھنے والے کو

محظوظ کرتا ہے۔ ندا کے کئی شعر بہت مشہور ہیں۔ شہر کی بولی جانے والی زبان میں شعر کہتے ہیں۔ آج سماجی مسائل اور جیتے جاگتے کردار، اپنی فکروں، اداسیوں اور شادمانیوں کے ساتھ ان کی غزل میں زندہ نظر آتے ہیں۔ ندا فاضلی نے غزلیں کم لکھی ہیں لیکن ان کے چند اشعار کی شہرت بہت دور تک پھیلی ہے:—

گھر سے مسجد ہے بہت دور چلو یوں کرلیں
کسی روتے ہوئے بچے کو ہنسایا جائے

☆

کبھی کسی کو مکمل جہاں نہیں ملتا
کہیں زمیں تو کہیں آسماں نہیں ملتا

ندا فاضلی نے غزل کے تقریباً ایک ہزار شعر کہے ہوں گے۔ ندا کی خوبی یہ ہے کہ چاہے وہ تصوف کی بات کریں یا کسی بچے کے کھلونے کا ذکر کریں، عام بول چال کی زبان اور نہایت سہل انداز میں کرتے ہیں۔ ان کو اپنی ماں سے بھی بڑی عقیدت تھی وہ اپنی شاعری میں ماں کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:

بانٹ کے اپنا چہرہ، ماتھا، آنکھیں جانے کدھر گئی
پھٹے پرانے اک البم میں چنچل لڑکی جیسی ماں

کہیں کہیں سے ہر چہرہ تم جیسا لگتا ہے
تم کو بھول نہ پائیں گے ہم ایسا لگتا ہے

تنہا تنہا دکھ جھیلیں گے محفل محفل گائیں گے
جب تک آنسو پاس رہیں گے تب تک گیت سنائیں گے

☆

بچوں کے چھوٹے ہاتھوں کو چاند ستارے چھونے دو
چار کتابیں پڑھ کر یہ بھی ہم جیسے ہوجائیں گے

☆

اپنا غم لیکے کہیں اور نہ جایا جائے
گھر میں بکھری ہوئی چیزوں کو سجایا جائے

☆

باغ میں جانے کے آداب ہوا کرتے ہیں
کسی تتلی کو نہ پھولوں سے اُڑایا جائے

ندا فاضلی نے اپنے اشعار میں نئی نئی کوششوں کے ساتھ نئے لفظیات اور نئے موضوعات کو پیش کیا ہے۔ ان کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ اپنے کلام میں نیا پن لائیں لیکن غزل کے حسن کو برقرار رکھنا بھی چاہتے ہیں۔ اپنے اشعار میں انہوں نے بہت احتیاط برتی ہے کہ ان کی غزل کہیں غیر غزلیہ یا مزاحیہ نہ ہوجائے۔ لیکن کہیں کہیں ان سے چوک بھی ہوجاتی ہے جس کا نمونہ یہ شعر ہے جس میں انہوں نے جدّت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے جس کی وجہ سے اس شعر کی شعریت میں کمی آگئی۔

سورج کو چونچ میں لئے مرغا کھڑا رہا
کھڑکی کے پردے کھینچ دیئے رات ہوگئی

ندا فاضلی کے یہاں مختلف احساسات اور جذبات کا اظہار ملتا ہے۔ انہوں نے زندگی میں بڑی جدو جہد کی ہے۔ آج جس مقام پر ان کی شاعری اور وہ ہیں اس کیلئے انہوں نے بڑی محنت کی ہے۔ دنیا کو وہ ایک بچے کے کھلونے کے سوا کچھ نہیں سمجھتے :—

دنیا جسے کہتے ہیں بچوں کا کھلونا ہے
مل جائے تو مٹی ہے کھو جائے تو سونا ہے

☆

جتنی بری کہی جاتی ہے اتنی بری نہیں ہے دنیا
بچوں کے اسکول میں شاید تم سے نہیں ملی ہے دنیا

☆

میری غربت کو شرافت کا ابھی نام نہ دے
وقت بدلا تو تیری رائے بدل جائے گی

☆

نقشہ اٹھا کے کوئی نیا شہر دیکھئے
اس شہر میں تو سب سے ملاقات ہوگئی

☆

دھوپ میں نکلو گھٹاؤں میں نہا کر دیکھو
زندگی کیا ہے کتابوں کو ہٹا کر دیکھو

صرف آنکھوں ہی سے دنیا نہیں دیکھی جاتی
دل کی دھڑکن کو بھی بینائی بنا کر دیکھو

☆

یہاں کسی کو کوئی راستہ نہیں دیتا
مجھے گرا کے اگر تم نکل سکو تو چلو

اس میں شک نہیں کہ ندا فاضلی مکمل شاعر اور ادیب ہیں۔ فلموں سے بھی وابستہ ہیں۔ وہ غزل اور نظم کے بھی اچھے شاعر ہیں۔ غزلیں کم کہنے کے باوجود بھی غزل کے اچھے اشعار ان کے یہاں مل جاتے ہیں۔

## مظہر امام

پیدائش : ۱۹۳۵ء مقام دربھنگہ (بہار)

مظہر امام ۵/ مارچ ۱۹۳۵ء کو دربھنگہ بہار میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے اپنی کتاب ''تنقید نما'' میں صفحہ نمبر ۲۵۷ پر اپنی پیدائش کے متعلق لکھا ہے کہ پرانے کاغذات میں ان کی پیدائش ۱۲/ مارچ ۱۹۲۸ء درج ہے۔ انہوں نے اپنی کتاب تنقید نما میں جو اپنا ذہنی سفر بیان کیا ہے اس سے صاف ظاہر ہے ہوتا ہے کہ ان کا خاندان متوسط گھرانے کی خوبیوں سے نئی زندگی کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مظہر امام جو کلاسیکل مزاج کے پروردہ تھے رفتہ رفتہ ترقی پسندی کی طرف مائل ہوئے کیوں کہ ترقی پسند شاعروں اور ادیبوں میں ان کا گہرا تعلق رہا اور وہ جدید تبدیلیوں سے واقف تھے۔ مظہر امام غزل کے

قابل ذکر شاعر ہیں۔ غزل کے ساتھ ان کی نظمیں بھی اچھے رسائل میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ وہ شاعری کے علاوہ تنقیدی مضامین بھی لکھتے ہیں۔ ''تنقید نما'' کے علاوہ ان کے مطبوعات کے نام ''پچھلے موسم کا پھول'' اور ''پالکی کہکشاں کی'' ہیں۔ مظہر امام کے اہم اور نمائندہ اشعار مثال کے طور پر درج ہیں جن میں ان کی جدّت طرازی اور ان کے ہم عصروں میں ان کے مقام کا اندازہ ہوتا ہے ان کے اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ غزل کے اہم شاعر ہیں۔

اس نے اس طرح اتاری میرے غم کی تصویر
رنگ محفوظ تو رہ جائیں پہ منظر نہ رہے
اس نے کس ناز سے بخشی ہے مجھے جائے پناہ
یوں کہ دیوار سلامت ہو مگر گھر نہ رہے
اب کے آندھی بھی چلی جب تو سلیقے سے چلی
یوں کہ رہ جائے شجر، شاخ ثمر ور نہ رہے

☆

تم نے شب ہجراں کی مجھ کو جو دعا دی ہے
میں نے بھی چراغوں کی لو اور بڑھادی ہے

☆

اب کیاں یہ دھواں سا اٹھ رہا ہے
یہ شہر تو کب کا جل چکا ہے
خوشبو سے کہو ادھر بھی آئے
سنتے ہیں گلاب کھل چکا ہے

☆

اپنی ہی خاک اُڑاتا پھروں ساحل ساحل
تیرے دریاؤں سے گزروں تو ہوا ہو جاؤں

☆

تیرا خیال تھا لپٹا ہوا دھندلکوں میں
سمندروں کا سفر تھا ہوا برہنہ تھی

مظہر امام کا تخلیقی سفر دراصل اس وقت شروع ہوا جب چاروں طرف ترقی پسندی کا چرچا تھا لیکن ان کی شاعری ترقی پسند جدیدیت، جدیدیت کے بعد اور نیا آہنگ یا قدیم تغزل کسی ایک خانے میں محصور نہیں کی جا سکتی۔ یہ بات اچھی ہے کہ انھوں نے غزل کی سینکڑوں سال کی قدیم روائیتوں کی ہمیشہ پاسداری کی لیکن ہر عہد کی تبدیلی کی طرف اگر ان کا دل نہیں مائل ہوا تو ذہن ضرور متاثر ہوا ہے اس لئے یہ کہ سکتے ہیں کہ ترقی پسند غزل گو شعراء کی جو مخصوص فہرست بنتی ہے اور نئی غزل کی وہ فہرست جو بہت جدید کہلاتی ہے ان دونوں میں ہم مظہر امام کو قید نہیں کر سکتے۔ ان کے یہاں نہ تو محمد علوی کی طرح سے وہ بے تکلف لہجہ ہے جو باتیں کرتے ہوئے شعری گفتگو بن جاتا ہے نہ ان کے یہاں ناصر کاظمی منیر نیازی کی طرح نیا تغزل پیدا ہوتا ہے نہ بشیر بدر اور ظفر اقبال کی غزلوں کی طرح لفظیات کا نیا پن نظر آتا ہے۔ ان کی خوبی یہ ہے کہ غزل کے کارواں میں ساٹھ ستّر سال ہمہ وقت چلتے رہے اور کسی مخصوص نظریہ کے علمبردار نہیں بنے۔ ان کے کچھ شعر یہاں پیش کئے جاتے ہیں جن کے موضوع بھی نئے ہیں اور لہجہ بھی الگ ہے:

اب کے جو وہ بچھڑا تو کوئی شاخ نہ سوکھی
اب کے میرے پہلو میں مرا دل ہی نہیں تھا

☆

مجھے پتہ تھا راہ میں چراغ جل نہ پائے گا
وہاں گیا تو اپنے ساتھ ماہتاب لے گیا

☆

مجھ کو پانا ہو تو ہر لمحہ طلب کرنا مجھے
رات کے پچھلے پہر مانگ دعا ہوں میں بھی
جانے کس راہ چلوں کون سے رُخ مڑ جاؤں
مجھ سے مت مل کہ زمانے کی ہوا ہوں میں بھی

مظہر امام کا یہ شعر تو واقعی ان کے عام شعروں سے کہیں بلند ہے:

یوں نہ مرجھا کہ مجھے خود پہ بھروسہ نہ رہے
پچھلے موسم میں تیرے ساتھ کھلا ہوں میں بھی

☆

اس دوراہے پہ کھڑا سوچ رہا ہوں میں بھی
تجھ سے بچھڑوں کہ زمانے سے جدا ہو جاؤں

☆

کرم تھے مجھ پہ کچھ اتنے میں سوچتا کیسے
کہ دوسروں پہ بھی وہ مہربان کتنا تھا

مظہر امام کی غزل کے کچھ شعر اس قدر سہل اور بول چال کی زبان میں ہوتے ہوئے بھی مقبولِ خاص و عام ہیں:

اک گزارش ہے، بس اتنا کیجئے
جب کبھی فرصت ہو آیا کیجئے
لوگ اس کا بھی غلط مطلب نہ لیں
اجنبیت سے نہ دیکھا کیجئے
خود کو اپنی آنکھ سے دیکھا تو ہے
اب مری آنکھوں سے دیکھا کیجئے

مظہر امام کی غزل کے چند عشقیہ شعر ملاحظہ ہوں:

مانا نگاہِ عشق میں معصومیت نہ تھی
جلوے مگر حضور کے خود بھی تھے بے قرار
دامن الجھ گیا تھا کبھی جن سے حسن کا
اب تک کھٹک رہے ہیں مری روح میں وہ خار
یوں تو زباں کو عشق سے انکار ہے مگر
دل نے خود اعتراف کیا اس کا چند بار
اپنی وفاؤں پر بھی ندامت ہوئی مجھے
وہ اس قدر تھے اپنی جفاؤ پہ شرمسار
تم خود جب اپنی شوخ ادائیں نہ گن سکے
میں داغ ہائے دل کا کروں کس طرح شمار
خود موت کو نہ جائے اماں مل سکی امامؔ
تھا دامنِ حیات کچھ اس طرح تار تار

# راجندر منچندا باؔنی

پیدائش: ۱۹۳۲ء     وفات: ۱۹۸۱ء

راجندر منچندا باؔنی کی پیدائش ۱۹۳۲ء میں ہوئی۔ بانی اپنے زمانے کے بہت مقبول شاعر تھے۔ ان کے یہاں جمالیات کے منفرد پہلونظر آتے ہیں۔ بانی کے لہجہ میں انفرادیت بھی پائی جاتی ہے اور تخلیقی عمل میں خوشگوار جدّت بھی لانے کی کوشش کرتے تھے۔ باؔنی ۱۹۴۷ء کے بعد ملتان (پاکستان) سے دہلی آ گئے تھے یہاں انہوں نے اپنی تعلیم پنجاب یونیورسٹی سے مکمل کی اور ایک پرائیویٹ اسکول میں ٹیچر ہو گئے۔ دہلی کی ادبی محفلوں میں شریک رہے اور اپنی شاعری کا سکّہ جمالیا۔ قدرت نے ان کو ادبی زندگی بھرپور مگر مختصر دی اور وہ بیماریوں میں گھر گئے۔ گھٹیا کی شدّت اور گردوں کے فیل ہوجانے کی وجہ سے ۱۹۸۱ء میں انتقال ہوگیا۔ ان کے شعری مجموعے ''حرف معتبر'' (۱۹۷۲ء)، ''حساب رنگ'' (۱۹۷۶ء) وہ ہیں جو ان کی زندگی میں شائع ہو گئے تھے۔ ''شفق شجر'' ان کے دنیا سے رخصت ہونے کے بعد ۱۹۸۳ء میں منظر عام پر آیا۔

جدید غزل گو شعراء میں باؔنی صف اوّل میں شمار ہوتے تھے۔ غزل کی اعلیٰ ترین روایتیں ان کے لہو میں گھلی ہوئی تھیں۔ ان کا ایک مخصوص لہجہ تھا۔ باؔنی کی بے وقت موت سے ہم ایک ایسے شاعر سے محروم ہو گئے جو ہمیں رہ رہ کر یاد آتا رہے گا۔

باؔنی کا دہلی کے شعراء میں اعلیٰ مقام ہے۔ ان کی شاعری کی امیجری قدیم غزل سے الگ ہٹ کر ہے۔ آج کی دنیا کو وہ اپنی نظر سے دیکھتے ہیں۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:

میری نظر میں ہے محفوظ آج بھی باقیؔ
بدن کسا ہوا ، ملبوس بے شکن اس کا

☆

شاعری کیا ہے کہ اک عمر گنوائی ہم نے
چند الفاظ کو امکان و اثر دینے میں

☆

چھتوں پہ بارش، دور پہاڑی، ہلکی دھوپ
بھیگنے والا پنکھ سکھانے والا میں
گھنے بنوں میں سنکھ بجانے والا میں
تیری طرف گھر چھوڑ کے آنے والا میں

(Urdu Ghazal, An Anthology by K.C. Kanda)

راجندر منچندا باقیؔ کے کلام کے مطالعہ سے محسوس ہوتا ہے کہ وہ ظاہر سے زیادہ باطنی جذبوں کے شاعر ہیں۔ کچھ استعارے منفرد ہیں جیسے سفر، اڑان، موڑ، گلی ، پانی، سمندر وغیرہ۔ ہر چیز میں نئی چیز کی تلاش۔ یہی وجہ ہے کہ کئی نقاد ان کو بہت منفرد شاعر مانتے ہیں۔

پانی سب کچھ اندر اندر دور بہالے جاتا ہے
کھوئی شئے اس گھاٹ نہ ڈھونڈ و ساتوں دریا دیکھو تم

(آزادی کے بعد اردو شاعری مرتبہ شہزاد انجم ۲۰۰۲ء، ساہتیہ اکادمی ، دہلی)

میں ندی پار کروں سوچ رہا ہوں باقیؔ
موج مصروف ہے پانی کو بھنور دینے میں

(Urdu Ghazal by K.C. Kanda 1969)

عجب نظارہ تھا بستی کے اس کنارے پر
سبھی بچھڑ گئے دریا سے پار اترے ہوئے

(رسالہ سطور ۱۹۷۰ء)

مجھکو اس دلچسپ سفر کی راہ نہیں کھوٹی کرنی
میں اجلت میں نہیں ہوں یارو! اپنا رستہ دیکھو تم

(رسالہ سطور ۱۹۷۱ء)

یہ انا کیسی درمیاں آئی
ہو چلی بزم دوستاں خالی
ایک اک دل وفا سے تھا محروم
گونجتا تھا مکاں مکاں خالی
گردشیں اہل غم پہ ٹوٹ پڑیں
اب زمیں خالی آسماں خالی
جب طبیعت ہی بھر گئی باقیؔ
نظر آنے لگا جہاں خالی

(مارچ ۱۹۶۲ء ماہ نامہ تحریک دہلی)

جانے وہ کون تھا اور کس کو صدا دیتا تھا
اس سے بچھڑا ہے کوئی اتنا پتہ دیتا تھا
جانے بستی کا وہ اک موڑ تھا کیا اس کے لئے
شام ڈھلتے ہی وہاں شمع جلا دیتا تھا

رُخ ہوا کا کوئی جب پوچھتا اس سے باؔنی
مٹھی بھر خاک ہوا میں وہ اُڑا دیتا تھا

راجندر منچندا باؔنی نے بہت سے منفرد خیالات کا اظہار اپنی شاعری میں کیا ہے۔ اردو ادب میں غزل کے تذکرے جب جب لکھے جائیں گے راجندر منچندا باؔنی کا ذکر ضرور آئے گا کیوں کہ وہ جدید غزل کے اچھے اور قابل ذکر شاعر ہیں۔

## مظفر حنفی

پیدائش: ۱۹۳۶ء، بمقام: کھنڈوہ

مظفر حنفی کا اصلی نام محمد ابو المظفر ہے۔ وہ یکم اپریل ۱۹۳۶ء کو کھنڈوہ میں پیدا ہوئے۔ مختلف ملازمتوں میں رہے۔ ابتداء میں مظفر حنفی نے محکمہ جنگلات میں ایک کلرک کی حیثیت سے ملازمت کی۔ ادبی زندگی کی ابتداء افسانہ نگاری سے ہوئی بعد میں شاعری بھی کرنے لگے۔ ۱۹۶۲ء میں انہوں نے علی گڑھ سے بی.اے. کیا۔ ۱۹۷۰ء میں سیفیہ کالج بھوپال سے ایم.اے. اور پھر ۱۹۷۴ء میں پروفیسر عبدالقوی دسنوی کے زیر نگرانی ''شاد عارفی شخصیت اور فن'' پر پی.ایچ.ڈی. کی ڈگری کے لئے مقالہ لکھا جس پر برکت اللہ نیورسٹی بھوپال سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے شعبہ اردو میں لیکچرر کی حیثیت سے ملازمت کی جہاں انھیں علمی ادبی ماحول اور اردو شعر و ادب کی اہم شخصیات کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔

مظفر حنفی نے زندگی کی حقیقتوں کو بیحد قریب سے دیکھا ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں طنز کے ساتھ تلخی بھی اکثر نظر آتی ہے۔

مثلاً:

نیاز مند مظفر کہاں سے ہو جائے
کہ بانکپن تو ہے اس کی سرشت میں داخل

☆

سر اونچا آنکھیں روشن، لہجہ بیباک ہمارا
تلوے زخمی ہاتھ بریدہ، دامن چاک ہمارا

☆

پیچیدہ عہد نو کی علامت کے نام پر
یاروں نے شاعری کو ٹھکانے لگا دیا

ان کے اشعار میں بے باکی، صاف گوئی اور حقیقت پسندی ہے سن کر اور پڑھ کر مزا آتا ہے۔ مظفر حنفی کے چند علامتی اشعار بھی پیش خدمت ہیں:—

چھتوں سے ستارے ٹپکنے لگے
ہری گھاس دیوار پر چڑھ گئی

☆

پتیوں نے اپنے کان کھڑے کر لئے ادھر
وحشی بگولہ ناچ رہا ہے پس غبار

☆

آنتوں سے پیر پیٹ کے اندر لپیٹنا
پھر سائرن کی چیخ پہ بستر لپیٹنا

مظفر حنفی کے کلام میں احساس کی شدّت ہے ان کے کلام میں وہ تمام بنیادی خصوصیات موجود ہیں جو ایک اچھے شاعر کے یہاں ہونی چاہئے۔ مظفر حنفی نے بھوک، غریبی، ظلم کے خلاف، رشتوں کے کرب، بے وفائیوں، ناانصافی وغیرہ پر طنزیہ انداز میں شعر کہے ہیں جو ان کی عصری حسیت اور سیاسی اور سماجی بصیرت کا پتہ دیتا ہے:

شکست کھا چکے ہیں ہم مگر عزیز فاتحو
ہمارے قد سے کم نہ ہو فرازِ دار دیکھنا

☆

اب جو بٹوارہ ہوا تو مورتی بھگوان کی
بانٹ لی جائے گی دو ٹکڑے برابر کاٹ کر

☆

ہاں تو کردار اک ایسا کہ مزہ آجائے
آج موقعہ ہے تجھے، کل مری باری ہوگی

☆

یوں تو جس کو آپ فرمادیں وہی ہے بے گناہ
ورنہ اک معیار جس کا ہاتھ جتنا سرخ ہے

☆

تو مری دکھتی رگوں کا آشنا
توڑ میرے پاس تیرے داؤں کے

مظفر حنفی کی عشقیہ شاعری میں ان کے استاد شاد عارفی کا رنگ بہت صاف نظر آتا ہے۔ ان کی عشقیہ غزل کے اشعار میں کھل کر بے جھجھک عشق کا اظہار ہے، شک اور

شکایت بھی ہے۔

آج ایک لڑکی نے میرا حافظہ مہکا دیا
رنگ تیرے پیرہن جیسا تھا بو تیری نہ تھی

☆

بات ہی کچھ اور ہے اس کی کمر کے لوچ کی
نرم رو جھرنا ابھی کچھ اور بل کھائے ذرا

☆

بجائے جاگتی آنکھوں کے خواب جھوٹے ہیں
مگر کرے بھی کوئی کیا جو آنکھ ہی نہ لگے

☆

پھینکا گیا ہے پھول جہاں سے رقیب پر
تشویش ہے وہ تیرا دریچہ نہ ہو کہیں

☆

میرے الجھے ہوئے حالات نظر میں رکھنا
عین ممکن ہے مجھے یاد نہ آؤ تم بھی

☆

چہرے پہ سات رنگ دھنک کے بکھر گئے
میرا گلہ بھی ان کے لئے غازہ ہوگیا

ان کے کلام میں لہجہ کی انفرادیت کے ساتھ ساتھ فکر کی ندرت بھی پائی جاتی ہے:

اپنے اشعار کے لہجے سے مظفر صاحب
بھیڑ میں دور سے پہچان لئے جاتے ہیں

☆

سخاوت سے کہا تھا مصلحت نے
کہ مُٹھی بند رکھ پیالے بہت ہیں

مظفر حنفی کی غزل گوئی پر تبصرہ کرتے ہوئے ان کے متعلق پروفیسر قوی دسنوی صاحب رقمطراز ہیں:

''جب مظفر حنفی صرف غزل کے ہو کر رہ جاتے ہیں تو غزل اپنی تمام تر رعنائیوں، نزاکتوں، لطافتوں اور سرمستیوں کو سمیٹ کر ایک خاص کیفیت کی ترجمانی کرتی ہے اور بہت زیادہ پرتاثیر بن جاتی ہے جس میں ان کی زندگی کی تلخیاں تو سماجاتی ہی ہیں سارے زمانے کا کرب ان کا اپنا کرب بن کر اسے اور زیادہ تیکھی نوکیلی اور انوکھی بنا دیتا ہے۔ یہی مظفر حنفی کی غزل کا رنگ ہے، مزاج ہے اور یہی ان کی امتیازی پہچان ہے۔''

(ڈاکٹر مظفر حنفی، حیات شخصیت اور کارنامے، ڈاکٹر محبوب راہی صفحہ نمبر ۱۴) موڈرن پبلیشنگ ہاؤس دریا گنج، دہلی۔

مظفر حنفی کے شعری مجموعے ''پانی کی زبان''، ''عکس ریز''، ''دیپک راگ''، ''طلسم حرف''، ''کھل جا سم سم'' وغیرہ ہیں۔ مظفر حنفی نے کھنڈوہ سے ایک ادبی ماہنامہ ''نئے چراغ'' بھی نکالا تھا۔

مظفر حنفی کے لہجے میں پائی جانے والی تلخی، تیکھا پن ان کو اپنے استاد شاد عارفی سے ورثہ میں ملا ہے۔ شاد عارفی بھی طنز کی تلوار سے معاشرے کی برائیوں پر بھرپور وار کرتے تھے۔ مظفر حنفی کے قلم میں بھی بہت دھار ہے۔ وہ معاشرے کی برائیوں پر بے تکان اور زبردست وار کرتے ہیں۔ زبان اور طرز بیان میں ہم آہنگی ہے۔ اکثر لہجہ سخت اور تیور کڑے ہو جاتے ہیں:

تسلیم سراسر ہوں کہ جڑے ہیں مرے ہاتھ
ممکن ہی نہیں تجھ سے مری جنگ الٰہی
تو نے تو مقدر میں بڑے عیش لکھے تھے
کیوں میری نظر چور ہے دل تنگ الٰہی

☆

اس سے پہلے کہ کروں تنگ نگہی کا شکوہ
اس نے تہمت مری بے باک نگہ پر رکھی

مظفر حنفی کی نظر اپنے چاروں طرف پھیلے سماج کی فکر اور انتظام کے لئے کوشاں رہتی ہے۔ ان کا قلم معاشرے کی سچّی تصویریں پیش کرنے سے نہیں چوکتا۔

مرے بچے کھڑے ہیں بالٹی لے کر قطاروں میں
کنویں، تالاب، نہریں اور فوّارے بناتا ہوں

☆

کھیتوں کھیتوں بھوک اُگی ہے دریا دریا پیاس کا عالم
رستے رستے پیڑ کھڑے ہیں سائے کو دامن پھیلائے

نئے موضوع، طنزیہ لہجہ اور حوصلہ مندانہ طرز بیان ان کی پہچان ہے:

بندوق کی نظر میں بھی قیمت ہے جان کی
سانبھر ہے فاصلے پہ، چکارا قریب ہے
جگنو بھی نارسا ہے اگر خوف دل میں ہو
ہمت بلند ہو تو ستارہ قریب ہے
ظاہر ہے جسم و جاں کی خسارہ قریب ہے
اک بلبلا رواں ہے کنارہ قریب ہے

☆

مجھے بھی دربدری میں لطف آتا ہے
میری بلا سے فراہم نہ کر درو دیوار

☆

دعا نہیں، آج ہاتھ پتوار مانگتے ہیں
شکستہ متول و بادباں، ہر طرف سمندر

☆

شہر میں اور سب خیریت ہے مگر
دن میں کرفیو رہا، سنسنی رات میں

میرؔ سے ناصر کاظمی تک جو غزل کی لے ہے اس سے مظفر حنفی نے بالارادہ انحراف کیا۔ غزل کو حد درجہ مہذب اور عاشقانہ لہجہ مانا جاتا ہے جس کی انھوں نے باشعور تردید کی۔ ان کی غزل کہیں تو نیا آہنگ لانے میں کامیاب ہے اور کہیں طنزیہ انداز اختیار کرلیا ہے۔

مظفر حنفی اور شاد عارفی میں جو خاص بات ہے وہ یہ ہے کہ غزل کے شعراء نے

جن موضوعات کو پردے میں رکھ کر ڈھکے چھپے الفاظ میں کہا تھا ان کی غزلوں میں وہ چہرہ بے نقاب ہو گیا۔ اس سے غزل میں ایک نئے لب ولہجہ کا اضافہ ہوا۔

''ڈاکٹر مظفر حنفی : حیات شخصیت اور کارنامے'' جو ڈاکٹر محبوب راہی کا مقالہ ہے جس کو کتابی شکل میں موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دریا گنج، دہلی نے ۱۹۹۸ء میں شائع کیا ہے اس میں محبوب راہی صفحہ ۴۹۶ پر رقمطراز ہیں:

''مظفر حنفی کو صرف خالصتاً طنزیہ شاعر کی نسبت سے یگانہ اور شاد عارفی کے سلسلے سے منسلک کیا جا سکتا ہے لیکن جہاں تک ان کی جدید غزل کا تعلق ہے ان کی حیثیت منفرد ہے۔ شاد عارفی سے اکتساب کردہ طنزیہ اسلوب میں عصری حسیت، تجریدیت، علامت نگاری، پیکر تراشی اور داخلی کیفیات جیسے نئی شاعری کے بنیادی اوصاف کی آمیزش سے مظفر حنفی نے اپنی آواز اور اپنے لہجے کو ایک نئے اور اچھوتے رنگ و آہنگ میں ڈھال کر پیش کیا ہے۔''

مظفر حنفی کی غزل اپنے آپ میں ایک انفرادی حیثیت رکھتی ہے۔ مطالعہ کی گہرائی، لہجہ میں سنجیدہ طنز اور مختلف موضوعات کو تیکھے انداز سے غزل میں پیش کر دینا مظفر حنفی کے فن کا کمال ہے۔

مظفر ہماری غزل کی ادا
نہ بھولے گا ہندوستاں مدتوں

# اختر نظمی

پیدائش: ۱۹۳۱ء　　　　وفات: ۱۹۹۲ء

اختر نظمی ۲۹ رنومبر ۱۹۳۱ء کو مہاراشٹر میں پیدا ہوئے تھے۔ شاعری ان کو ورثہ میں ملی تھی۔ ان کے والد ممتاز الدین بیخود بھی اچھے شاعر تھے۔ اختر نظمی نے اردو میں فرسٹ ڈویژن میں ایم اے کیا اور ٹاپ کرنے کی وجہ سے گولڈ میڈل بھی حاصل کیا۔

کملا راجہ گرلس کالج گوالیار میں صدر شعبہ اردو کی حیثیت سے درس و تدریس کا کام کرتے رہے۔ ۱۹۹۲ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ جسمانی طور پر کمزور اور ناتواں ہمیشہ سے تھے اور پھر زندگی کے آخری مہینوں میں بیماریاں ان پر حاوی ہوگئیں تھیں۔ بہت ہمت صبر و استقلال سے کام لیتے رہے لیکن ملازمت سے سبکدوش ہونے کے چند ماہ بعد ہی ان کا انتقال ہوگیا۔ انتقال کے وقت ان کی عمر ۶۲ سال تھی۔

اختر نظمی نے جن اصناف میں طبع آزمائی کی وہ خاص طور سے غزل اور دوہے ہیں۔ مشاعروں میں وہ اپنا کلام تحت میں اور کبھی بہت خوبصورت ترنم میں سناتے تھے۔ تمام ہندوستان میں مشاعرے پڑھنے گئے اور مقبول بھی ہوئے۔ ان کی شاعری میں سادگی تھی، زبان اور بیان کا اپنا ایک علیحدہ انداز تھا۔

اب نہیں لوٹ کے آنے والا
گھر کھلا چھوڑ کے جانے والا

ان کی غزل سادہ اور سلیس زبان اور سیدھے سادے طرزِ بیان کا اعلیٰ نمونہ پرانی روایتوں سے نکل کر نئی تراکیب نئے نئے رجحانات اور نئی لفظیات انہوں نے اپنی

شاعری میں داخل کئے۔ ان کے سادہ اور آسان شعر بہت مقبول خاص و عام ہوئے۔

ناؤ کاغذ کی چھوڑ دی میں نے

اب سمندر کی ذمہ داری ہے

ان کی شاعری میں جدّت تھی اور نئی امیجری کی کامیاب عکاسی تھی۔ ان کے مخصوص انداز اور جدید لفظیات سے بھرپور چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ریت کے گھر تو بہہ گئے نظمی

بارشوں کا خلوص جاری ہے

☆

میں غلط لوگوں میں گھر جاتا ہوں

تم مجھے چھوڑ کے جاتے کیوں ہو

☆

بچے اداس بیٹھے ہیں پنجرے کے آس پاس

جیسے سمجھ رہے ہوں پرندوں کی گفتگو

☆

تمھیں ملا نہ اسے مل سکا نہ مجھکو ملا

میرا تو نام ہی لکھا تھا اس کھلونے پر

☆

تم سے کچھ اور تعلق ہے زمانے سے کچھ اور

تم زمانے کی نگاہوں سے نہ دیکھو مجھکو

☆

پیاس بجھتی نہیں زمینوں کی

ایک بادل کہاں کہاں برسے

اختر نظمی کی کتاب ''سوا نیزے پہ سورج'' پر بشیر بدر اختر نظمی کی غزل کے متعلق لکھتے ہیں:

''سادہ نکھری زبان میں مہذب طنز، معصوم زندگی سے بھرپور ڈاکٹر اختر نظمی کے شعر ہمارے عہد میں نایاب ہیں۔ بڑی معصومیت سے سامنے کی بات شروع کرتے ہیں اور ہوش مندی سے زندگی کی تلخ حقیقتوں کو ''غزل'' بنا دیتے ہیں۔''

اختر نظمی خود اپنی کتاب ''سوا نیزے پہ سورج'' کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں:

''میری شاعری اپنے لئے راستے خود بناتی چلتی ہے۔ سمت اور رفتار کا تعین کرتی ہے۔ موضوعات اور ان موضوعات کے شاعرانہ اظہار کے لئے مناسب اصناف کی تلاش اور انتخاب بھی خود ہی کر لیتی ہے۔ ۱۹۵۵ء تک میری شاعری کا لہجہ تبدیل ہوتے ہوتے اس شاعری سے منسلک ہو گیا جسے آج جدید شاعری کہتے ہیں۔''

دروازے کے شیشے نہ بدلوایئے نظمی

لوگوں نے ابھی ہاتھ سے پتھر نہیں پھینکے

☆

فاصلہ ہے تو تعلق بھی ہے کچھ لوگوں میں

ساتھ رہئے گا تو سب دل سے اتر جائیں گے

اس میں شک نہیں کہ جدید غزل میں اختر نظمی نے اضافہ کیا ہے اور اختر نظمی غزل کے ان اضافوں کی بنا پر ہمیشہ یاد کئے جائیں گے۔

## فضل تابش

پیدائش: ۱۹۳۳ء وفات: ۱۹۹۵ء

فضل تابش ۵/اگست ۱۹۳۳ء کو بھوپال میں پیدا ہوئے۔ بی.اے. کرنے کے بعد ۱۹۵۳ء میں کلرک کی حیثیت سے سرکاری ملازمت اختیار کی۔ اردو میں ایم.اے. کرنے کے بعد دسمبر ۱۹۲۹ء میں حمیدیہ کالج میں لیکچرر ہوئے۔ ۱۹۸۰ء سے ۱۹۹۱ء تک وہ مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی کے سکریٹری رہے۔

فضل تابش خود ساختہ شخصیت کے مالک تھے۔ اردو ادب کی دنیا میں وہ صرف میدانِ غزل کے قید و بند میں محدود نہیں تھے بلکہ نظمیں افسانے اور ڈرامے بھی لکھتے تھے۔ انسان کی حیثیت سے ان کے ہم عصر لوگ ان کی خوش مزاجی، انسانی ہمدردی اور اخلاقی قدروں کی تعریف کرتے ہیں۔ فضل تابش ایک اعلیٰ درجے کے سماجی شخصیت کے مالک تھے۔ ان میں انسانی ہمدردی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی جس کے سب قائل تھے۔ شاعری میں اگر انھیں کچھ اور وقت ملتا تو ان کی نئی سوچ میں سر بلندی بھی آتی اور گہرائی بھی لیکن وقت نے ان کو ہم سے بہت جلد چھین لیا۔

ان کا یہ شعر اپنے جدید لہجے کے سبب بہت مشہور ہوا تھا:

ریشہ ریشہ ادھیڑ کر دیکھو
روشنی کس جگہ سے کالی ہے

ان کے چند شعر اور پیش خدمت ہیں:

خوب شہروں سے گزرنے کی سزا پائی ہے
رات جلتے ہوئے چہرے پہ اتر آئی ہے

☆

سوتے ہوؤں میں بیٹھا وہ زندہ دکھائی دے
تنہا ملے تو جینے سے اوبا دکھائی دے

وہ غزل کی روایات کی پاسداری کرتے تھے اور اکثر اشعار میں جدید لہجے کی ترجمانی بھی کر جاتے تھے۔ مثلاً یہ شعر ملاحظہ ہو:

ترک لباس اس کے لئے لازمی نہیں
مجھکو وہ ہر لباس میں ننگا دکھائی دے

فضل تابش کے یہاں محبت کے شعروں کے ساتھ ساتھ معاشرے کی خامی اور امیر زادوں پر طنز بھی ملتا ہے، مثلاً

دھوپ چڑھے تک سوتی بستی کے باشندوں سے ملئے
انسانوں سے ملتی جلتی تازہ قبروں سے ملئے

☆

جس سے ملتے ہو کام ہوتا ہے
بے غرض بھی کبھی کسی سے ملو

کہیں کہیں فضل تابش کے شعروں میں روایتی خوبیوں کے ساتھ نئی فکر بھی نظر آتی ہے۔ ان کے کئی شعر انکی اپنی نئی سوچ کا اظہار ہیں:

کھیلتے بچوں میں پیغمبر ہے کون
سوچئے اور سوچئے اندر ہے کون

☆

میں چڑیوں کو الجھتے دیکھ کر لڑتی سمجھتا ہوں
مگر سچائی کیا ہے یہ انھیں سے پوچھنا ہوگا

فضل تابش کے اندر بزلہ سنجی تھی جوان کے اشعار میں بھی مل جاتی ہے۔

اس نے تو بہت دیر تلک ہاتھ ہلائے
میں دوسری لڑکی کی طرف دیکھ رہا تھا

☆

کون کس سے ڈرا ہوا ہے یہاں
بزدلو بزدلوں میں فرق بتاؤ

فضل تابش اپنے عہد کے مزاج آشنا تھے۔غزل کی لفظیات میں توسیع کرنا چاہتے تھے۔اس سلسلے میں انھیں کامیابی بھی ملی۔ایسی تجرباتی تخلیقات میں سو فیصد کامیابی ممکن نہیں لیکن یہ بہت معنی خیز ہے کہ شاعر غزل جیسی روائتی اور قدیم صنف سخن میں اپنے عہد کی تبدیلیوں کو برتنا چاہے اور اس کوشش میں کہیں کہیں انھیں کامیابی بھی ملی:

تمھیں خبر ہے گھروندوں سے کھیلتے بچو!
میں تم میں اپنا گیا وقت دیکھ لیتا ہوں

☆

سورج اونچا ہوکر میرے آنگن میں بھی آیا ہے
پہلے نیچا تھا تو اونچے میناروں پر بیٹھا تھا

☆

سنا ہے یہ زمیں اُڑتی پھرے گی روئی کی صورت
تماشہ کرنے والا ہی تماشہ دیکھتا ہوگا

☆

کمرے میں آکے بیٹھ گئی دھوپ میز پر
بچوں نے کھل کھلا کے مجھے بھی جگا دیا

۱۰ر نومبر ۱۹۹۵ء کو اپنے عہد کا یہ مزاج آشنا شاعر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس دار فانی سے کوچ کر گیا۔

## ادا جعفری

پیدائش: ۲۲ر اگست ۱۹۲۴ء بمقام: بدایوں یوپی

آدا جعفری کی پیدائش ۲۲ر اگست ۱۹۲۴ء کو بدایوں (یو. پی.) میں ہوئی۔ ادا جعفری اپنے عہد کی صنف اوّل کی شاعرہ ہیں۔ انہوں نے ادب میں اپنا ایک الگ مقام حاصل کیا۔ ان کے اشعار میں شگفتگی اور فکر و خیال میں تازگی ہے۔ ان کی شاعری کے عروج کا دور فراق اور فیض کا دور تھا۔ اِن مقبول شاعروں سے کاندھا ملا کر چلنے کی کوشش میں مجاؔز، مجروؔح، سلطان پوری، جذبی اور سردار جعفری وغیرہ بھی سرگرم تھے۔

آدا جعفری کا کمال یہ تھا کہ وہ ان شعراء سے فائدہ اٹھانے کے باوجود اپنے آپ کو ایک منفرد مقام تک لے گئیں اور اپنی شناخت کروانے میں کافی حد تک کامیاب بھی رہیں۔ آدا جعفری کو انفرادیت اور مقبولیت آسانی سے نہیں حاصل ہوئی بلکہ ان کو بڑی دقّتوں کا سامنا کرنا پڑا۔

آداجعفری کی کتاب ''سازِ سخن'' جو مکتبہ جامعہ نئی دہلی نے شائع کی ہے اس کتاب کا تعارف پاکستان کے حمایت علی شاعر نے لکھا ہے۔ حمایت علی شاعر صفحہ نمبر ۹ پر ''سازِ سخن'' کے تعارف میں لکھتے ہیں:

''آداجعفری ان شاعرات میں سے نہیں ہیں جو انسانیت کے اظہار کو نمائش کی حد تک لے آتی ہیں اور اس حجاب سے بے نیاز ہوجاتی ہیں جو شاعری کا جوہر ہے۔ آدا کی سلیقہ مندی اس عظیم روایت کی عطا ہے جس کی ذرخیزی جدّت کے خوبصورت امکانات کی ضامن ہے۔ وہ جدید شاعرہ ہونے کے باوجود اس جدیدیت کی دلدل سے دور ہیں جو اکثر شعراء کو ڈبو چکا ہے۔''

(سازِ سخن صفحہ نمبر ۹ اشاعت ۱۹۸۸ء)

آداجعفری کے شعری مجموعے ''سازِ سخن بہانہ ہے'' (۱۹۸۲ء) ''غزالہ تم تو واقف ہو'' (۱۹۷۴ء ''شہرِ درد'' (۱۹۶۷ء اور ''میں ساز ڈھونڈتی رہی'' (۱۹۵۰ء) شائع ہو چکے ہیں۔

آداجعفری کے یہاں ترنم کے ساتھ ساتھ لطافت اور الفاظ کو بے حد خوب صورتی سے برتنے کا سلیقہ پایا جاتا ہے۔ آداجعفری نے اپنی آپ بیتی ''جو رہی سو بے خبری رہی'' کے عنوان سے لکھی ہے۔ جس میں انہوں نے مختلف ممالک میں گزارے گئے دنوں کو اس خوش اسلوبی سے بیان کیا ہے کہ قاری خود ان کے ساتھ سفر میں شریک ہوجاتا ہے۔

۳۷۴ صفحات کی اس کتاب کو مکتبہ دانیال وکٹوریہ چیمبرز، عبداللہ ہارون روڈ کراچی نے شائع کیا ہے۔ آداجعفری دنیا بھر سے دادِ تحسین وصول کرچکی ہیں اور اب ادا

جعفری کا شمار ایسی محترم شخصیات میں ہوتا ہے جو فن اور ادب کی باریکیوں پر بڑی گہری نظر رکھتی ہے۔

بلا شبہ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ خواتین شاعرات کی فہرست میں ادا جعفری کا نام بے حد معتبر ہے ان کے علاوہ بھی کئی شاعرات نے مقبولیت حاصل کی جن میں قابل ذکر کشور ناہید، حمیرا رحمٰن، پروین شاکر وغیرہ ہیں۔ ادا جعفری کے چند اشعار جو مختلف کیفیات کے ہیں ملاحظہ ہوں:

بجھا بجھا کے چراغِ وفا جلائے ہیں
خطا معاف سمجھ کر فریب کھائے ہیں

☆

نہ آستاں نہ کوئی بام و در ہی جی کو لگے
چلن سدا سے یہی سر پھری ہوا کا تھا

☆

ہزار غنچوں نے چاہا الگ تھلگ رہنا
جو کوئی شوخ کرن آپ ہی الجھ جائے

☆

اٹی ہوئی تھی دھوپ سے جو رہ گزر تھی سامنے
دیار دل میں کون تھا کہ چاندنی چٹک گئی

ادا جعفری کے کئی شعر ایسے مل جائیں گے جن میں انہوں نے نرم اور ملائم لہجہ میں بات کہنے کی کوشش کی ہے اور کئی شعروں میں عام انسانی مسائل کو اپنی شاعری کا

موضوع بنایا۔

ہم بھی خوشبو ہیں صبا سے کہیو
ہم نفس روز نہ ملتے ہوں گے

☆

صبح زنداں میں بھی ہوتی ہوگی
پھول مقتل میں بھی کھلتے ہوں گے

☆

اجنبی شہر کی گلیوں میں آدا
دل کہاں! لوگ ہی ملتے ہوں گے

☆

ہاتھ کانٹوں سے کرلئے زخمی
پھول بالوں میں اک سجانے کو
کتنے مجبور ہوگئے ہوں گے
اَن کہی بات منہ پہ لانے کو

☆

یہ خود فریب اجالے یہ ہاتھ ہاتھ دیئے
دیئے بجھاؤ کے انسان غم کو پہچانے
جو ہم سفر بھی رہے ہیں شریک منزل بھی
کچھ اجنبی تو نہ تھے پھر بھی کم کو پہچانے

آدا جعفری کا کلام پاکستان کے رسالے ''نقوش'' لاہور میں شائع ہوتا رہا ہے۔ ''نقوش'' کے ستمبر ۱۹۸۲ء کے شمارے میں جو ادا جعفری کی غزل شائع ہوئی اس کے چار خوبصورت شعر ملاحظہ ہوں :

وہ بے پناہ خوف جو تنہائیوں میں تھا
دل کی تمام انجمن آرائیوں میں تھا
اک لمحۂ فسوں نے جلایا تھا جو دیا
پھر عمر بھر خیال کی رعنائیوں میں تھا
اندھیری راہ مسافر کہیں نہ بھٹکا تھا
کسی منڈیر پہ جب تک چراغ جلتا تھا
سفر تمام ہوا اور حیرتیں نہ گئیں
جو قربتیں تھیں وہاں فاصلہ بلا کا تھا

آدا جعفری کی شاعری میں مردانہ عزم اور نسائی لوچ اپنے پورے اوج پر ہے۔ آدا جعفری کے شعروں میں ہمیں جدائی کی کسک بھی ملتی ہے اور وصل کی سرشاری بھی۔ ادا جعفری کے چند اور اشعار ملاحظہ ہوں:

راہوں میں کوئی آبلہ پا اب نہیں ملتا
رستے میں مگر قافلہ سالار بہت ہیں
لہجہ کی کھنک ہو کہ نگاہوں کی صداقت
یوسف کے لئے مصر کے بازار بہت ہیں

☆

اک راہ رُک گئی تو ٹھٹھک کیوں گئیں آدا

آباد بستیاں ہیں پہاڑوں کے پار بھی

☆

کیا جانئے کس بات پہ مغرور رہی ہوں

کہنے کو تو جس راہ چلا یا ہے چلی ہوں

تم پاس نہیں ہو تو عجب حال ہے دل کا

یوں جیسے میں کچھ رکھ کے کہیں بھول گئی ہوں

آدا جعفری کی غزل میں نسائیت کے ساتھ حوصلہ، سعادت مندی، شوخی، عشق سبھی کچھ پایا جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ آدا جعفری کی غزلیں سہل زبان میں ہونے کے ساتھ ساتھ نسوانی جذبات سے بھرپور ہیں۔

## کشور ناہید

پیدائش: ۱۹۴۰ء بمقام: یوپی (ہندوستان)

کشور ناہید کا شمار پاکستان کی ممتاز شاعرات میں ہوتا ہے۔ ۱۸ / جون ۱۹۴۰ء کو ہندوستان میں پیدا ہوئیں۔ کشور ناہید یو. پی. ہندوستان کی رہنے والی ہیں۔ وہ ۱۹۴۹ء میں تقریباً نو سال کی عمر میں اپنے والدین کے ساتھ لاہور (پاکستان) چلی گئیں۔ تعلیم لاہور کالج اور گورنمنٹ کالج سے حاصل کی۔ اس کے بعد مرکزی حکومت کے محکمہ اطلاعات

میں ملازمت کی۔ پاکستان میں کشور ناہید کے فکروفن کو جلا ملی وہ وہاں کے اعلیٰ رسائل ''نقوش'' اور ''سویرا'' لاہور ''نیا دور'' کراچی میں مسلسل لکھتی رہیں اور گاہے بہ گاہے ریڈیو ، ٹی.وی. اور معیاری مشاعروں میں شرکت بھی کرتی رہیں۔ کشور ناہید آج کی نسوانی غزل کی منفرد شاعرہ ہیں۔ ان کے یہاں فکر مسلسل ارتقاء پذیر ہے، جب وہ نوعمر شاعرہ تھیں تبھی ان کے کئی شعروں کو ادبی حلقوں میں شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی۔

کشور ناہید خوب صورت محبت سے بھرپور جذبات کی شاعرہ ہیں جو زندگی بخش خیالات سے لبریز ہیں۔ ان کے لہجے میں مٹھاس ہے، ان کا دل محبت اور خلوص سے پُر ہے۔ اپنے محبت سے بھرپور شعروں میں وہ آج کی ذہین لڑکی نظر آتی ہیں۔ ناہید کی ذہانت منفی نہیں، انہیں محبت کی سچّائی پر پورا یقین ہے۔ وہ محبت کے جواب میں سچّی محبت چاہتی ہیں۔ انھیں اس بات کا فخر ہے کہ :

میں گھر کی روشنی ہوں مجھے محفلوں سے کیا
چہروں کے میکدوں میں نہ دینا صدا مجھے

کشور ناہید، سچے نورانی اور محبت بھرے چہروں اور آج کی عیش وعشرت کی محفلوں کے پسندیدہ چہروں کا فرق بخوبی جانتی ہیں۔

ہر ایک لمحہ یہی بے کلی سی ہے دل میں
کہ ان کو یاد کریں ان کو بھول جائیں بھی

☆

وہ اجنبی تھا پھر بھی لگا آشنا مجھے
کس سمت لے چلا ہے نیا حادثہ مجھے

کشور ناہید کے غم میں سچائی ہے۔ دل سے دل کا دائمی رشتہ چاہتی ہیں لیکن جدید مشینی عہد میں انسانی رشتوں میں جو تبدیلی آرہی ہے وہ ان کی محبت پر یوں اثر انداز ہوتی ہے۔

کنویں بھی ختم ہوئے پنگھٹوں کا دور گیا
یہی سبب ہے کوئی تہہ میں جھانکتا ہی نہیں

اور اس تبدیلی پر وہ اس طرح احتجاج کرتی ہیں۔

رواروی میں ہے ہر ایک صحبتِ یاراں
ملیں سکوں سے تو قصّے تیرے سنائیں گے

کشور ناہید کو پڑھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ محبت کی سچائی کی قائل ہیں۔ ان کا ایمان محبت کی گہرائی پر ہے وہ ایسے آئینہ خانے میں سنورنا نہیں چاہتی ہیں جہاں انسانیت کا چہرہ وقتی ضرورتوں کے ساتھ بدل جاتا ہے۔

چھپا کے رکھ دیا پھر آگہی کے شیشے کو
اس آئینے میں تو چہرے بگڑتے جاتے ہیں

کشور ناہید زندگی کے فریب کو جان کر بروقت احتجاج بھی کرتی ہیں۔

تمہارے شہر کے لڑکوں کو کیاں ہوا ناہید
بہت اداس ملے کوئی دل دکھانہ ملا

کشور ناہید محبت کا پیکر ہونے کے ساتھ مردم شناس بھی ہیں۔ انہیں پاکستان کے معاشرے کی لڑکی اور اس کے گھر والوں کی بعض مجبوریوں کا غم بھی ہے۔

ہماری عمر تو ہے بیل، عشق پیچاں کی
ڈھلک پڑے گی اگر کوئی آسرا نہ ملا

☆

واقف نہیں ہوں شکل سے اطوار سے مگر
لگتا ہے اس کا نام ہی اکثر بھلا مجھے

کشور ناہید کے یہاں محبت کے خوب صورت جذبات کے شعر ہیں۔ یہ اظہار ہندوستانی اور پاکستانی خوبصورت ذہن کی مالک شاعرات ہی کرسکتی ہیں۔نئی تعلیم یافتہ لڑکے لڑکیاں محبت اور زندگی کو حسین انداز سے دیکھنا چاہتے ہیں۔ فنی طور پر بھی ان کی زبان اور لہجے میں جدّت ہے کہیں کہیں تو ان کے خوب صورت اسلوب نے شعروں کو بہت معصوم اور خوبصورت بنا دیا ہے۔

کچھ یوں بھی زرد زرد سی ناہید آج تھی
کچھ اوڑھنی کا رنگ بھی کھلتا ہوا نہ تھا

☆

تمھاری یاد میں ہم جشن غم منائیں بھی
کسی طرح سے مگر تم کو یاد آئیں بھی

☆

مجھ خستہ تن کو گھر میں کہاں ڈھونڈتے ہو اب
دو دشت نامرادیٔ دل میں صدا مجھے

کشور ناہید کا مجموعہ ''دائروں میں پھیلی لکیر'' مکتبہ جامعہ، دریا گنج نئی دہلی سے شائع ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ ''فتنۂ سامانی دل'' سنگ میل پبلیکیشن لاہور سے ۱۹۸۵ء میں شائع ہوا تھا۔ کشور ناہید کو نظم اور غزل دونوں میں مہارت حاصل ہے اور مقبولیت بھی۔ ان کی غزل کے چند شعر پیش ہیں جن میں اظہار کی لطافت اور شگفتگی اور ایک داخلی

ترنم کی آمیزش ہے۔ مشاعروں میں ان کی معیاری غزلوں اور نظموں کی وجہ سے ان کو مقبولیت ملی۔ کشور ناہید کی غزلوں میں مشاعرے کا کوئی ہلکا پن نہیں تھا بلکہ فکر وفن کا حسین امتزاج تھا:

سنبھل ہی لیں گے مسلسل تباہ ہوں تو سہی
عذاب زیست میں رشکِ گناہ ہوں تو سہی

☆

یہ میری ذات تو مجھ میں سماں کے رہ نہ سکے
وہ دشت ہوں کہ سمندر چھپا کے رہ نہ سکے

کشور ناہید نے فکر آمیز غزلیں لکھی ہیں جو ادبی رسائل میں بڑی پابندی سے چھپتی تھیں اور ادبی حلقوں میں ان پر گفتگو ہوتی تھی۔ ادبی محفلوں اور مشاعروں میں ان کی شرکت محفلوں اور مشاعروں کی کامیابی کی ضامن تھی۔ اب بھی ان کے یہاں فکر وفن کا دائمی ارتقاء ملتا ہے جو اور فنکاروں کے یہاں مشکل سے نظر آئے گا۔ انھوں نے اپنے اسلوب کی شناخت کو برقرار رکھا ہے۔ ان کی غزل اردو غزل کا ایک منفرد لہجہ بن گئی ہے۔

تمام عمر یونہی رَت جگوں سے کیا حاصل
انھیں بھلائیں ذرا نیند کو بلائیں بھی

## پروین شاکر

پیدائش: ۱۹۵۲ء وفات: ۱۹۹۴ء

پروین شاکر کے والدین تقسیم ہند کے بعد پاکستان چلے گئے تھے۔ پروین اردو غزل کی مشہور شاعرات میں ایک منفرد مقام رکھتی ہیں۔ یہ اردو غزل کی کم نصیبی ہے

کہ عین عالم جوانی میں وہ اللہ کو پیاری ہوگئیں۔ اردو غزل میں انہوں نے بہت جلد اپنی پہچان بنائی تھی۔ ۱۹۷۷ء میں ان کا پہلا مجموعہ ''خوشبو'' شائع ہوا جسے بے مثال مقبولیت حاصل ہوئی۔ وہ اپنی کم سنی میں ہی ہندوستان میں ہندوستان اور پاکستان کے ڈی سی ایم کے مشاعرے میں دہلی تشریف لائی تھیں تب وہ مشکل سے بیس بائیس سال کی ہوں گی۔ مشاعرے کے اختتام کے بعد عوام کے ساتھ وہاں موجود تمام شعراء اور ادباء سب کی زبان پر ان کا یہ شعر تھا۔

حسن کے سمجھنے کو عمر چاہئے جاناں
دو گھڑی کی چاہت میں لڑکیاں نہیں کھلتیں

ابتداء سے ہی ان کی غزل کے شعر دھیرے دھیرے ساری اردو دنیا میں مشہور ہوتے گئے ان شعروں میں غزل گوئی کی کئی سو سالہ تربیت تہہ نشیں تھی اور ان کا لہجہ بیسویں صدی کی ہندوستانی اور پاکستانی لڑکی کا سچا اور اور خوب صورت غزلیہ لہجہ تھا۔

ایم. جمال علوی نے اپنے مضمون '' دور حاضر کی نمائندہ پاکستانی شاعرات مطبوعہ رسالہ نیا دور لکھنؤ جنوری ۱۹۹۰ء کے صفحہ ۲۱ پر پروین شاکر کے متعلق لکھا ہے:

''پروین شاکر بھی خواتین کی نئی نسل کی نمائندہ بن کر ابھری ہیں اور رومانیت سے اظہاریت کی جانب مائل بہ سفر ہیں اور اس طرح اندھے رنگ تغزل کو بینائی عطا کرتی چلی جاتی ہیں۔''

پروین شاکر کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

دل پہ اک طرفہ قیامت کرنا
مسکراتے ہوئے رخصت کرنا

کون چاہے گا تمھیں میری طرح

اب کسی سے نہ محبت کرنا

گھر کا دروازہ کھلا رکھا ہے

وقت مل جائے تو زحمت کرنا

دراصل پروین شاکر نے اردو کی قدیم اور عظیم روائیتوں کا بھرپور مطالعہ کیا تھا۔ ان کے یہاں امیجری کی کیفیت بھی بہت ہے۔ وہ بیسویں صدی کی نمائندہ شاعرہ تھیں۔ قدیم زمانے میں عورت غزل لکھے یا مرد، اسے غزل، غزل کی زبان میں لکھنا پڑتی تھی۔ مؤنث کی زبان ممنوع تھی۔ پروین شاکر کے زمانے میں بھی بہت سی خواتین پرانی روایت پر پابند تھیں لیکن اس عہد میں پروین کے ساتھ دوسری کئی شاعرات نے غزل کی اس روایت سے انحراف کیا اور واضح انداز میں عورت کے تجربات کا بیان عورت کی زبان میں اپنی غزل میں کیا۔ ان کے ان اشعار میں نئی امیجری بھی نظر آتی ہے۔ غزل کا نسوانی لہجہ ملاحظہ کیجئے:

کمال ضبط کو خود بھی تو آزماؤں گی

میں اپنے ہاتھ سے اس کی دلہن سجاؤں گی

سپرد کر کے اسے چاندنی کے ہاتھوں میں

میں اپنے گھر کے اندھیروں کو لوٹ جاؤں گی

جواز ڈھونڈ رہا تھا نئی محبت کا

وہ کہہ رہا تھا کہ میں اس کو بھول جاؤں گی

اس لہجے سے الگ کلاسیکل شاعری کا پروین نے بھرپور مطالعہ کیا تھا۔ وہ میرؔ و غالبؔ کے کلام کی تربیت یافتہ تھیں:

پابہ گل سب ہیں رہائی کی کرے تدبیر کون
دست بستہ شہر میں کھولے میری زنجیر کون
آج دروازے پہ دستک جانی پہچانی سی ہے
آج میرے نام لاتا ہے میری تعزیر کون

☆

سکوتِ شہر سخن میں وہ پھول سا لہجہ
سماعتوں کی فضا خواب خواب کردے گا

پروین شاکر کے ان اشعار میں جو رنگ و آہنگ ہے اس سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ انھوں نے ابتداء میں اردو غزل کی قدیم روایتوں کا بھرپور مطالعہ کیا تھا۔ انھیں اس بات کا ادراک بھی تھا کہ غزل کو اپنے عہد کی بول چال والی زبان میں ہی لکھا جانا چاہئے تاکہ وہ ہر کسی کی اپنی آواز لگے مثلاً پروین شاکر کے یہ اشعار اس بات کی تصدیق کرتے ہیں:

پورا دکھ اور آدھا چاند
ہجر کی شب اور ایسا چاند
یادوں کی آباد گلی میں
گھوم رہا ہے تنہا چاند
میرے منہ کو کس حیرت سے
دیکھ رہا ہے بھولا چاند
اتنے گھنے بادل کے پیچھے
کتنا تنہا ہوگا چاند

رات کے شاید ایک بجے ہیں

سوتا ہوگا میرا چاند

پروین شاکر اردو غزل کی ایک نئی، خوب صورت اور اہم آواز ہیں جو ہماری غزل کی تاریخ کا ایک حصہ بن گئی ہیں۔ پروین شاکر کے بہت سے شعر اردو غزل کے کڑے سے کڑے انتخاب میں ہمیشہ پورے اترے ہیں اور ان کو وقار حاصل ہوا ہے:

میں سچ کہوں گی مگر پھر بھی ہار جاؤں گی

وہ جھوٹ بولے گا اور لاجواب کردے گا

☆

جس طرح خواب میرے ہوگئے ریزہ ریزہ

اس طرح سے نہ کبھی ٹوٹ کے بکھرے کوئی

☆

وہ چاند بن کے میرے ساتھ ساتھ چلتا رہا

میں اس کے ہجر کی راتوں میں کب اکیلی ہوئی

☆

خوش نہ تھا مجھ سے بچھڑ کر وہ بھی

اس کے چہرے پہ لکھا تھا لوگو

☆

شام بھی ہوگئی دھندلا گئیں آنکھیں میری

بھول نے والے میں کب تک تیرا رستہ دیکھوں

انگلیوں کو تراش دیں پھر بھی
عادتاً اس کا نام لکھیں گی

ڈاکٹر بشیر بدر، پروین شاکر کے بارے میں ہندی رسم الخط میں شائع کتاب ''رحمتوں کی بارش'' میں لکھتے ہیں:

''غالب کے انسانی اسلوب کی نسائی توسیع اگر دہلی لکھنؤ میں رضائے الٰہی ہوتی تو ہندوستان کی اس آتما کو آب وگل کا پیکر کراچی میں کیوں عطا کیا جاتا۔ دوسری رات کا مشاعرہ اس شعر کے نام روز ازل سے لکھا جا چکا تھا:

جگنو کو دن کے وقت پرکھنے کی ضد کریں
بچے ہمارے عہد کے چالاک ہوگئے

اس غزل کا نام پروین شاکر ہوگیا۔ غالبؔ دنیا جہاں جیت کے بھی جو اولاد کی نعمت سے محروم ہوگئے تھے انھیں اللہ پاک نے ایسی بیٹی دی جو اپنے باپ کے سارے ہنر کو آنے والی صدیوں کی مہارتیں عطا کرسکتی ہے۔

یہ اس کی فتح کا پہلا لمحہ تھا جو انشاء اللہ قیامت تک مفتوح نہیں ہوگا۔ وہ اب ہمارے درمیان نہیں ہیں لیکن دلوں پر اس کی حکومت ہندوستان اور پاکستان کی کیا ساری زمین سر کر چکی ہے۔''

(''رحمتوں کی بارش'' مرتب ڈاکٹر بشیر بدر
وانی پرکاشن، دہلی، صفحہ نمبر ۶)

بلا شبہ پروین شاکر ایک فطری اور بڑی شاعرہ تھیں۔ ان کے ذکر کے بغیر ہماری جدید شاعری کی تاریخ نامکمل رہے گی۔ پروین شاکر کی اس لئے بھی اردو شاعری میں اہمیت ہے کیوں کہ ہماری شاعری کی تاریخ میں مشکل سے ایسی دو تین شاعرات کی مثالیں ملیں گی جن کے کلام اور فکر وفن کو نمائندہ شاعروں کی اعلیٰ شاعری کے مقابل پیش کیا جا سکے۔

پروین شاکر کے حالات زندگی جو ماہنامہ ''کتاب نما'' نئی دہلی جون ۱۹۹۹ء شمارہ نمبر ۶ جلد نمبر ۳۹ میں شائع ہوئے ہیں پیش ہیں جو کہ ایک ریڈیائی فیچر ہے جس کو مشاغل ادیب ایم اے مشیر آباد، حیدر آباد نے لکھا ہے۔ (صفحہ نمبر ۷۵)

> ''پروین شاکر ۲؍نومبر ۱۹۵۲ء کو ثاقب حسین شاکر کے گھر پیدا ہوئیں۔ رضویہ گرلز کالج سے ۱۹۶۶ء میں میٹرک کا امتحان کامیاب کیا۔ سرسید گرلز کالج سے ۱۹۶۸ء میں ایف.اے. اور ۱۹۷۱ء میں بی.اے. کیا۔ بعد ازاں جامعہ کراچی سے انگریزی ادبیات اور لسانیات میں ایم.اے. کیا۔
>
> انھوں نے ۱۹۷۱ء کی جنگ میں ذرائع ابلاغ کا کردار کے موضوع پر ڈاکٹریٹ بھی کی اور ہارورڈ یونیورسٹی سے بینک ایڈمنسٹریشن میں ایم.اے. بھی کیا تھا۔
>
> ملازمت کے اعتبار سے پروین شاکر ابتداء میں درس و تدریس سے منسلک رہیں اور ۹ سال تک عبداللہ گرلز کالج میں لکچرر کی خدمات انجام دیتی رہیں۔ بعد ازاں سول سروس میں امتیازی

کامیابی کے بعد محکمہ کسٹمز سے وابستہ ہوگئیں۔ ۱۹۸۶ء میں وہ سیکنڈ سکریٹری سی بی آر اسلام آباد متعین کی گئیں۔

پروین شاکر کی شادی ۱۹۷۶ء میں ڈاکٹر نصیر علی سے ہوئی۔ ڈاکٹر نصیر علی خوش شکل اور بظاہر تمام تر خوبیوں کے مالک تھے۔ وہ پاکستانی آرمی کور سے منسلک تھے اور اپنی خدمات کے سلسلے میں ہمیشہ باہر رہا کرتے تھے۔

پروین شاکر کی زندگی اور سوچ کا انداز نیا تھا مگر اس کی سسرال روایتی انداز کی شدّت سے پرستار تھی۔ پروین شاکر نے اپنے آپ کو سسرال کے روایتی ماحول میں ڈھالنے کی کوشش کی، مگر ناکام رہیں۔

سسرال میں پروین شاکر کو نہایت ہی دردناک حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ انھیں یہاں ہر صبح ایک نئے کرب کا شکار ہونا پڑتا تھا تو ہر شام ان پر آفتوں کی قیامت ٹوٹتی تھی۔ دن بدن حالات بگڑتے ہی گئے اور ڈاکٹر نصیر نے ۱۹۸۷ء میں انھیں طلاق دے دی۔ پروین شاکر کے ڈاکٹر نصیر علی سے ایک لڑکا ہوا جس کا نام مراد ہے۔

پروین شاکر نہایت ہی حساس تھیں۔ اس حادثے نے انھیں بے حد رسوا کیا۔

کیسے کہہ دوں کہ مجھے چھوڑ دیا ہے اس نے
بات تو سچ ہے مگر بات ہے رسوائی کی

ڈاکٹر نصیر علی نے دوسری شادی کر لی مگر پروین شاکر کا کمال ضبط دیکھئے۔

کمال ضبط کو خود بھی تو آزماؤں گی
میں اپنے ہاتھ سے دلہن تری سجاؤں گی

مگر عورت عورت ہی ہوتی ہے۔ اس کی غیرت نسوانیت کے لبوں پر یہ بول جگمگا اٹھے۔

وہ مجھ کو چھوڑ کے جس آدمی کے پاس گیا
برابری کا بھی ہوتا تو صبر آجاتا

پروین شاکر کا گھرانہ علمی و ادبی روایتوں کے ساتھ مذہبی ماحول بھی رکھتا تھا۔ ان کے ذہن میں مذہب ہر وقت موجود رہتا تھا مگر انھوں نے اپنی فکر کو جو پیکر عطا کیا اور اپنی ندرت طرازی سے اس میں جو رنگ بھرا وہ قابل قدر ہے۔''

پروین شاکر کی یہ غزل ان کی اندرونی کیفیت کی عکاسی کرتی ہے۔

پابہ گل سب ہیں رہائی کی کرے تدبیر کون
دست بدستہ شہر میں کھولے میری زنجیر کون
دشمنوں کے ساتھ میرے دوست بھی آزاد ہیں
دیکھنا ہے کھینچتا ہے مجھ پہ پہلا تیر کون
کوئی مقتل کو گیا تھا مدتوں پہلے مگر
ہے در خیمہ پہ اب تک صورت تصویر کون

میری چادر تو چھنی تھی شام کو تنہائی میں
بے ردائی کو مری پھر دے گیا تشہیر کون

پروین شاکر کے اشعار میں گہرائی اور سچائی کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ وہ عورت کی ہر کیفیت کو شاعری میں باآسانی ڈھال لیتی تھیں۔ مثلاً

جو صبح خواب لگا شب کو پاس کتنا تھا
بچھڑ کے اس سے مرا دل اداس کتنا تھا

☆

سکون دل کے لئے میں کہاں کہاں نہ گئی
مگر یہ دل کے سدا اس کی انجمن میں رہا
میں برگ برگ اس کو نمو بخشتی رہی
وہ شاخ شاخ میری جڑیں کاٹتا رہا
تیرا خیال کر کے میں خاموش ہوگئی
ورنہ زبان خلق سے کیا کیا نہیں سنا

☆

ایک ہی شہر میں رہ کر جن کو اذن دید نہ ہو
یہ ہی بہت ہے ایک ہوا میں سانس تو لیتے ہیں

☆

ہاتھ میرے بھول بیٹھے دستکیں دینے کا فن
بند مجھ پر جب سے اس نے گھر کا دروازہ کیا

یہ اشعار بھی بہت خوب ہیں:

درست ہے نئی راہوں سے واسطہ رکھنا
روایتوں سے بھی خود کو مگر جڑا رکھنا

☆

کئی رُتوں سے مرے نیم وا دریچوں میں
ٹھہر گیا ہے ترے انتظار کا موسم

☆

کانپ اٹھتی ہوں میں یہ سوچ کے تنہائی میں
میرے چہرے پہ تیرا نام نہ پڑھ لے کوئی

☆

کہیں رہے وہ مگر خیریت کے ساتھ رہے
اٹھائے ہاتھ تو یاد ایک ہی دعا آئی

☆

یکلخت گرا ہے تو جڑیں تک نکل آئیں
جس پیڑ کو آندھی میں بھی ہلتے نہیں دیکھا

☆

رائے پہلے سے بنالی تو نے
دل میں اب ہم ترے گھر کیا کرتے

پروین شاکر کی شاعری خالص نسائی شاعری ہے۔ ان کے اشعار میں کہیں

کنواری لڑکی ہے تو کہیں سمجھدار اور حساس عورت ہے۔ کسی شعر میں شوہر پرست بیوی نظر آتی ہے۔ پروین شاکر کی شاعری میں ان کی انفرادیت ان کا لب ولہجہ اور خیالات کا اظہار ہے۔ اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ اگر پروین شاکر کو زندگی اور موقع دیتی تو یقیناً وہ کچھ اور کمالات شاعری کی دنیا میں دکھاتیں۔

## حمیرا رحمٰن

پیدائش: ۱۹۵۷ء مقام کراچی (پاکستان)

حمیرا رحمٰن ۲۴ر نومبر ۱۹۵۷ء کو کراچی میں پیدا ہوئیں۔ حمیرا پاکستان کی ایک مقبول شاعرہ ہیں۔ حمیرا ان دنوں اپنے شوہر سید نسیم الرحمٰن کے ساتھ نیویارک میں مقیم ہیں۔ حمیرا رحمان کی شاعری میں عورت کا مزاج اس کی شخصیت کی انفرادیت نظر آتی ہے۔ حمیرا رحمٰن کے علاوہ جن شاعرات نے مختلف اور نئے موضوعات پر غزلیں لکھی ہیں ان میں زہرہ نگاہ، ادا جعفری، کشور ناہید، پروین شاکر، ساجدہ زیدی، عشرت آفریں کے نام لئے جا سکتے ہیں۔

حمیرا کے یہاں شاعری میں نسوانیت پروین شاکر کی طرح کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ مرد کی بالادستی اور عورت کے لئے بنائے ہوئے سخت قانون کے خلاف احتجاج بھی ملتا ہے۔

جھوٹ بولوں تو سب بیاضیں تجھ سے ہی منسوب کروں
سچ بولوں تو لکھنے میں اوروں کا ذکر بھی آتا ہے

☆

مرا یقیں مجھ سے چھین لیں گے
یہ مجھ پہ پہرے حفاظتوں کے

☆

دیواروں پر جیسے جیسے چھاؤں پڑی
سائے میرے قد کے برابر ہونے لگے

☆

اپنے آپ کو اس کے حوالے سے جانوں
یوں بھی اپنے ہونے کا اندازہ کروں

☆

تو اپنے در سے مجھے خالی ہاتھ مت لوٹا
مرے حساب میں جی بھر کے بے وفائی دے

☆

ہم تو نہ کچھ کہنے کا ارادہ کر کے بیٹھے تھے
اس کی بات کے دھیمیں پن سے کنگن بول اٹھے
گرتے گرتے تھام لیا ہے کئی صداؤں نے
میری ماں کی مدھم نامحسوس دعاؤں نے
میں نے تو آواز پہ اس کی کان لگائے تھے
بند دریچہ کھول دیا ہے تیز ہواؤں نے

حمیرا کی غزل میں فکر اور احساس کی ہم آہنگی نئے سے نئے مضمون کو سچّی اپنائیت دیتی ہے کہ پڑھنے والا اس میں طرح طرح کے معنے نکال سکتا ہے۔ غزل بُت شیوہ ہزار رنگ ہے۔ بعض شعر سیدھے سیدھے دل میں اترتے ہیں اور پھر عوام کی زبان پر آجاتے ہیں اور گفتگو کا حصہ بن جاتے ہیں لیکن بعض غزل کے شعر جو اتنی عوامی مقبولیت نہیں حاصل کرتے وہ بھی اپنی معنویت گہرائی اور نئی طرز ادا کی وجہ سے دھیرے دھیرے

ایک پودے کی طرح اگتے ہیں اور وقت کے ساتھ ان کی شہرت سے زیادہ ان کی معنویت کا چرچہ ہونے لگتا ہے۔ حمیرا رحمٰن ایسی شاعرہ ہیں جن کے یہاں تفکر احساس بنتا ہے اور بلا آخر غزل کا باوقار شعر بن جاتا ہے۔

وہ لمحہ جب میرے بچّے نے ماں پکارا مجھے
میں ایک شاخ سے کتنا گھنا درخت ہوئی

☆

آج اِس راہ سے وہ گزرا ہے
آج میں فرش نہ دھونا چاہوں

حمیرا رحمٰن کے یہ دو شعر اس کڑے معیار پر پورے اترتے ہیں۔ اکثر ازلی انسانی جذبے کے بطن سے ایسا لازوال شعر پیدا ہوتا ہے جو بالکل نیا نیا سا محسوس ہوتا ہے اور اسی سے اس کی انفرادیت اہمیت اور صداقت کا احساس ہوتا ہے۔ ان شعروں میں سے پہلے میں وہ ماں ہے جس سے انسان کا روز ازل شروع ہوا۔ دوسرا شعر رومانی ہے۔ شاعروں نے ایسے بے شمار شعر کہے ہیں جن میں محبوب کے قدموں کے نشان کا بھی احترام کیا ہے لیکن حمیرا کا یہ سادہ سا شعر کس قدر پُر اثر اور پُر کار ہے۔ حمیرا رحمٰن در حقیقت فطری شاعرہ ہیں۔ ان کے یہاں بہت سے لازوال شعر بھی ہیں اور لڑکیوں کے معصوم ناپختہ رومانی جذبوں والے شعر بھی، مثلاً:—

ہم اسے اپنے لئے محدود سمجھے تھے مگر!!
اب کھلا اس چاند پر عرصے سے تھی گھر گھر کی آنکھ

روز تمہارے زخموں کو میں تازہ کروں
اور پھر اپنی چاہت کا اندازہ کروں

حمیرا رحمٰن کے اشعار میں غزل کی رمزیت، اشاریت کے وہ خوب صورت کنائے اور استعارے بھی استعمال ہوئے ہیں جن کی مثال یہ اشعار ہیں۔

بچہ لاکھ برے لوگوں کی صحبت میں پروان چڑھے
معجزے اب بھی ماں کی بھر آنے والی آنکھوں میں ہیں

☆

میری انگلی کی انگوٹھی میں لگی پتھر کی آنکھ
اور دریچوں میں سمٹ آئی محلّے بھر کی آنکھ

☆

روشن دان سے دھوپ کا ٹکڑا آ کے میرے پاس گرا
اور پھر سورج نے کوشش کی مجھ سے ہاتھ ملانے کی

حمیرا رحمٰن کی غزلیں ہندوستان اور پاکستان کے ادبی رسائل میں چھپتی رہتی ہیں۔ افکار کراچی ان کا پسندیدہ پرچہ ہے۔ وہ اپنے ضمیر کی آواز اور روح کی داخلی صدا پر شعر کہتی ہیں۔ وہ باقاعدہ ترقی پسند (مارکسی) نہیں ہیں۔ باشعور اسلامی خاتون ہیں۔ انھوں نے غزل اور نظم دونوں میں جدید تبدیلیوں کو تجزیاتی طور پر قبول کیا ہے۔ نیویارک میں اردو ادب کی سرگرم کارکن ہیں۔

ان کے کئی شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن میں ''اندمال'' ۱۹۸۴ء میں نیویارک میں شائع ہوئی۔ اس میں محمد علی صدیقی کا مضمون جس کا عنوان ہے ''حمیرا رحمٰن ۔آوازوں کی آواز'' صفحہ ۱۱۔اس میں حمیرا کی شاعری کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:

''حمیرا کی شاعری یادوں کے خمیر سے اٹھتی، اردگرد کے حقائق پر

نظر ڈالتی ہے۔ وطن کی جانب واپس لوٹتی ہے۔ ضروری اور مفید
تبدیلیوں کے بارے میں سرگوشیاں کرتی ہے اور تبدیل شدہ
انسانی رشتوں پر اظہار خیال کرتی ہوئی آگے بڑھ جاتی ہے۔ یہ
سیدھی سمت میں سفر کر کے بعد مراجعت اور پھر دوبارہ عزم سفر کی
شاعری ہے۔''

حمیرا رحمٰن کی شاعری کے بارے میں ادا جعفری نے اس طرح اظہار خیال کیا ہے:

''موسم کی پہلی بارش کے بعد کچے آنگن میں جو سوندھی خوشبو اٹھتی
ہے حمیرا رحمٰن کی شاعری اس کی یاد دلاتی ہے۔''

(اندمال ۱۹۸۴ء)

چند شعر پیش خدمت ہیں:

کس سے پوچھیں ہم کو چاہنے والے جا کر کہاں چھپے
بستی کے ہونٹوں پہ چپ ہے اور دروازوں پر تالہ

☆

نیا بہانہ ہے مصروف خود کو رکھنے کا
جہاں چراغ جلانا وہیں ہوا کرنا

حمیرا رحمٰن کا دوسرا مجموعہ ''انتساب'' ۱۹۹۷ء کو نیویارک میں شائع ہوا۔ اس
مجموعے میں افتخار عارف ''ایک مکمل شاعرہ'' کے عنوان سے لکھتے ہیں۔

(صفحہ نمبر ۱۶)

''ایک مکمل شاعرہ بننے کے لئے جن عناصر کو لازمی کہا جاتا ہے وہ

حمیرا کے ہاں موجود ہیں۔ باقی فیصلے کا انحصار وقت پر مگر توفیق
دینے والا کسی کو انعام اس لئے تو عطا نہیں کرتا کہ اس کا جوہر
تخلیق بارآور وثمر دارانہ ہو۔‘‘

چند اشعار ملاحظہ ہوں:

میں نے ہمیشہ مانگی ہے اپنے آنگن کی خیر
جب بھی حمیرا افق پہ شام گلابی ہوتی ہے

☆

تمام عیب و ہنر خوش لباس لگنے لگے
دھویں نے شہر پہ کیا سرمئی لبادہ کیا

☆

یہ کیسا خوف ہے جس میں زبان رکتی نہیں
میں چپ رہوں تو کوئی اور بول پڑتا ہے

## کیف بھوپالی

پیدائش: ۲۰ر فروری ۱۹۱۷ء          وفات: ۲۴ر جولائی ۱۹۹۱ء

کیف بھوپالی کا نام خواجہ محمد ادریس تھا۔ ان کے والد کا نام خواجہ محمد ابراہیم تھا۔
۲۰ر فروری ۱۹۱۷ء کو کیف پیدا ہوئے۔ دلّی اور لکھنؤ جیسے مراکز سے دور رہے اس لئے
انہیں ہندوستان گیر شہرت ذرا دیر سے ملی لیکن چند ہی برس میں وہ پوری اردو دنیا کے

پسندیدہ شاعروں میں شمار ہونے لگے۔ ان کا آخری مجموعہ کلام جس میں بڑی حد تک ان کی تمام غزلوں کا انتخاب بھی ہے اور نئی غزلیں بھی ہیں وہ ۱۹۹۳ء میں دلی میں شائع ہوا جس کے شائع ہونے میں مالی امداد عالمگیر شہرت کی مالک ڈاکٹر اختر جہاں ملک نے کی۔ اس کتاب کا پیش لفظ اختر سعید خاں نے لکھا اور کتاب کا اجراء دبئی کے عالمی مشاعرہ میں کیا گیا۔

اپنے پیش لفظ میں اختر سعید خاں نے کیف بھوپالی کے فکر وفن کی مختلف جہتوں کا بہت اچھا تجزیہ کیا ہے۔ اختر سعید خاں لکھتے ہیں:۔

''کیف کے لفظوں کی سوتی اور غنائی خاصیت موسیقی سے رچا ہوا اسلوب مترنم بحریں جذبے کی تابناکی اور فزا آفرینی ایک سیل کی صورت سننے والے کو بہالے جاتی ہے۔ کیف صاحب ۵۰ سال سے زیادہ عرصے تک غزلیں نظمیں اور گیت لکھتے رہے۔ ان کی نظموں اور گیتوں نے بھی سننے والوں سے خراج تحسین حاصل کیا لیکن دیکھا جائے تو انہیں ممتاز کرنے والی ان کی عشقیہ شاعری ہے۔ اس میں شک نہیں کہ کیف کی غزل انہیں راہوں سے گزری ہے جو غزل کی مقررہ راہیں ہیں لیکن ان کی غزل میں جو عاشقانہ بانکپن، حسن وصداقت ہے وہ صرف ان کا حصہ ہے۔''

اختر سعید خاں آگے لکھتے ہیں:

''کیف صاحب وقت کے تقاضوں اور عصری رجحانات سے خوب واقف تھے۔ انہیں ترقی پسند ادب کی تحریک سے گہری

وابستگی تھی۔ وہ محض مہر و وفا کے قائل نہ تھے اور وہ اپنی گرم نوائی
کی بنا پر قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کر چکے تھے۔ کیف کی
شاعری ایک رفیق سفر کی طرح ہمارے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔''

مثال کے طور پر:

ڈر گیا ہوں کہ مجھے نیند نہ آجائے کہیں
جب سرِ راہ کوئی چھاؤں گھنی دیکھی ہے

☆

ماں کی آغوش میں کل موت کی آغوش میں آج
ہم کو دو وقت یہ دنیا میں سہانے سے ملے
مجھکو غم حیات سے فارغ نہ جانئے
ہونٹوں پہ کچھ ہنسی ہے تو دیوانہ پن کی ہے

ان کا یہ شعر نہ صرف ان کی شاعری کی شناخت ہے بلکہ ہماری جدید غزل کا ایک محبوب ترین شعر ہے، ملاحظہ فرمائیں :

گل سے لپٹی ہوئی تتلی کو گرا کر دیکھو
آندھیوں تم نے درختوں کو گرایا ہے بہت

کیف بھوپالی کے بہت سے ایسے شعر ہیں جو ہماری آج کی زندہ اور پائندہ غزل کے سرمائے میں ہمیشہ شامل اور مقبول رہیں گے، مثلاً

در و دیوار پہ شکلیں سی بنانے آئی
پھر یہ بارش میری تنہائی چرانے آئی

☆

دیر و حرم کے بعد کہاں جائیے کے اب
اک شمع رہ گئی جو تیرے انجمن کی ہے

ان کے شاعرانہ اسلوب میں دو خوبیاں بہت اہم تھیں وہ اکثر ایسی بحروں میں غزلیں کہتے تھے جو بہت مترنم ہوں اور ان کو یہ کمال حاصل تھا کہ وہ گفتگو کے لہجہ میں غنائیت پیدا کر لیتے تھے۔ یہ خوبی ان کی پہچان بن گئی تھی، مثلاً:

ہائے لوگوں کی کرم فرمائیاں
تہمتیں، بدنامیاں، رسوائیاں

☆

گم ہے نگاہِ شوق حجابوں کے شہر میں
پردوں کے چلمنوں کے، نقابوں کے شہر میں

یہ اشعار جو بظاہر بہت آسان زبان میں ہیں لیکن غزل کے راز داں جانتے ہیں کہ گفتگو کا یہ آسان لہجہ اور دلوں میں اترنے کا یہ فن ہزار مشکل پسندی سے زیادہ مشکل کام ہے، مثلاً

تیرا چہرہ کتنا سہانا لگتا ہے
تیرے آگے چاند پرانا لگتا ہے
ترچھے ترچھے تیر نظر کے چلتے ہیں
سیدھا سیدھا دل پہ نشانہ لگتا ہے

ایک اور غزل میں بھی یہی آہنگ اور یہی تیور ہیں:

کھیل یہی کھیلا تم نے لڑکپن سے
جو بھی ملا شیشہ توڑ دیا چھن سے

یہی نہیں کہ کیف بھوپالی کا لہجہ خالی عاشقانہ تھا بلکہ وہ بنیادی طور پر ترقی پسند نظریات کے ماننے والے شاعر تھے اور وہ عوام کے ان تمام دشمنوں پر بھرپور حملہ کرتے تھے جن کی وجہ سے غریب ہمیشہ غریب رہتا ہے اور زندگی کی نعمتوں سے بھی محروم ہو جاتا ہے، مثلاً:

یہ داڑھیاں یہ تلک دھاریاں نہیں چلتیں
ہمارے عہد میں مکّاریاں نہیں چلتیں

کیف بھوپالی ہمارے عہد کے ایسے مقبول ترین شاعر تھے جن کی شمولیت کے بغیر کوئی مشاعرہ مکمل نہیں سمجھا جاتا تھا۔

تیری زلفوں کا وہ سایہ نہ سہی
تیری یادوں کا شجر باقی ہے

۲۴ر جولائی ۱۹۹۱ء کو کیف بھوپالی ایک طویل علالت کے بعد اس دار فانی سے رخصت ہو گئے۔

## سیلانی سیوتے

پیدائش: ۲۴ر جون ۱۹۴۱ء

سیلانی سیوتے ہندی اور اردو غزل کے شاعر کہلانے کے مستحق ہیں۔ انہوں نے اردو میں ''برگ چنار'' میں جو غزلیں لکھی ہیں وہ قابل قدر ہیں۔ ان کی اس کتاب سے یہ پتہ چلا کہ ان کو اردو سیکھنے کا بچپن سے شوق تھا اور اردو کا پہلا قاعدہ ان کی نانی نے ان کو تحفہ میں لا کر دیا تھا۔ اس کتاب کو انہوں نے اپنی نانی کے نام انتساب کیا ہے۔

سیلانی سیوتے نے ابتدائی تعلیم سیہور میں حاصل کی۔ شعر و شاعری کی طرف ان کا رجحان بچپن سے تھا۔ ۱۹۶۰ء میں سیہور سے بھوپال آگئے اور ڈاکٹر شفا گوالیاری کے شاگرد ہوئے اور تعلیم جاری رکھتے ہوئے سیفیہ کالج سے ایم.اے. اور ایل.ایل.بی. کیا۔

انہوں نے دہلی ٹیلی ویژن میں ملازمت کی اور کچھ عرصہ بعد سری نگر، کشمیر بھیج دیئے گئے۔ ان کا شعری مجموعہ "برگ چنار" کشمیر کی خوبصورت وادیوں میں مکمل ہوا۔ چند شعر ملاحظہ فرمائیں:

کتنا دلکش نام ہے برگِ چنار
فیض تیرا عام ہے بگرِ چنار
عکس جہلم میں ہے تیرا چار سو
مسکراتی شام ہے برگ چنار
کانگڑی میں زیست کی گرمی لئے
خلد کا انعام ہے برگِ چنار

اپنی اس ہجرت کی زندگی سے متاثر ہوکر کہتے ہیں:

ہم بھی سیلانی بھٹکا کئے عمر بھر
لے گئی جب اِدھر سے اُدھر زندگی

ان کی غزل کی تہہ دار دلسوز محبت اور انسانی شرافت کو اسی عہد کی فارسی نما اردو سے بھرپور شاعرانہ لطف ملا ہے۔ ان کی غزلوں میں شاعری کی روایت کو برقرار رکھا گیا ہے۔ زبان اور شاعری سے محبت اور لگن کی وجہ سے ان کو دنیائے شعر و ادب میں ایک اہم مقام حاصل ہوا۔

مشاہدات اور تجربات کو غزل کا حصہ بنا دینے کا فن ان کو بخوبی آتا تھا۔

موند کر اپنی پلکیں چھپالوں تجھے
لگ نہ جائے کسی کی نظر زندگی
وقت گزرا ہوا پھر نہیں آئے گا
تو نے دیکھا بھی مڑ کر اگر زندگی

☆

جرم ہے لَب کشائی یہاں پر
جو بھی پوچھو اشاروں سے پوچھو!

☆

دل ہے امیدوں کا اک شہر خموشاں اے دوست
زیست ویران تھی یادوں کے نگر سے پہلے

جہاں انھیں عمر انصاری اور کیف بھوپالی جیسے عظیم استاد شاعروں نے بہت پسند کیا۔ وہاں آج کی جدید غزل کے نمائندہ شاعر ڈاکٹر بشیر بدر نے بھی بہت سراہا۔

محترم عمرآن انصاری ''برگِ چنار'' میں شامل اپنے مضمون میں لکھتے ہیں:

''داغ دہلوی کی شاعری، سیماب اکبر آبادی کے توسط اور شفا گوالیاری کے وسیلہ سے اپنی تیسری پیڑھی میں سیلانی سیوتے کی شاعری کے روپ میں جلوہ گر ہوئی ہے۔ اس اعتبار سے اگر سیلانی سیوتے اس امر کے مدّعی ہوں تو بے جانہ ہوگا کہ:

''تیسری پُشت ہے اس دشت کی سیّاحی میں'' ہر چند کہ سیلانی سیوتے صرف غزل ہی غزل یا نظم ہی نظم کے قائل نہیں ہیں بلکہ

دیگر اصناف سخن بھی ان کی شاعری میں شامل ہیں۔''

(برگ چنار، صفحہ نمبر ۸، نامی پریس لکھنؤ، ۱۹۸۴ء)

کیف بھوپالی نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے سیلانی سیوتے کے متعلق لکھا:

''سیلانی گوناگوں صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ آرٹسٹ بھی ہیں یعنی نقش ونگار کے خوش نویس بھی ہیں، اردو کے بہترین شاعر اور ادیب بھی ہیں۔''

(برگ چنار، صفحہ نمبر ۱۶، نامی پریس لکھنؤ، ۱۹۸۴ء)

ڈاکٹر بشیر بدر کے تاثرات سیلانی سیوتے کے لئے کچھ اس طرح ہیں:

''غزل ہندوستان کا تہذیبی نغمہ ہے، اس نغمہ کے لاشعور میں، اس عظیم و وسیع ملک کا ماضی اور حال دونوں تخیل ہیں، سیلانی سیوتے اپنی ابتدائی تربیت اور بعد میں زندگی اور ادب کے مختلف تجربات سے ایسے تجربوں اور مشاہدوں کے شاعر ہیں جس میں بھوپال کی ادبیت، کشمیر کا بیدار حسن، پنجاب کا البیلاپن اڑیسہ کی بولیوں کی معصومیت اور شام اودھ کی شائستگی پر چھائیاں یکجا ہوتی جارہی ہیں۔

سیماب اسکول کے وہ شاعر ہیں، ہندی ان کے گھر کی زبان ہے، اردو ان کے دل کی آواز ہے۔''

(برگ چنار، صفحہ نمبر ۱۹، نامی پریس لکھنؤ، ۱۹۸۴ء)

سیلانی سیوتے نے غزل کی عظیم اور قدیم لفظیات احساسات اور داخلی محبت

سے اپنی غزل کو سنوارا اور نئی دنیا کی آواز میں آواز شعوری طور پر ملائی۔ اس لئے ان کی غزل میں سچائی نظر آتی ہے۔ وقت نے ان کا ساتھ نہیں دیا ورنہ ان کی شاعری میں وہ اشارے نظر آنے لگے تھے جو ناصر کاظمی، احمد فراز، بشیر بدر اور ندا فاضلی کے یہاں بھرپور نظر آتے ہیں۔ ان شاعروں کی طرح سیلانی کی شاعری نے بھی پڑھنے والوں کے دلوں کو متاثر کرنا شروع کر دیا تھا۔ کاش وہ آج ہم میں ہوتے تو ہندوستان اور پاکستان کی نئی غزل کا بلاشبہ ایک اہم نام ہوتے۔ یوں بھی اپنے عہد کے وہ قابل ذکر شاعر تھے۔

جدید غزل کے جن نمائندہ شعراء کا ذکر اس باب میں تفصیل سے کیا گیا ہے ان کے علاوہ بھی کئی اہم جدید غزل گو شعراء عصر حاضر میں غزل کے تناور شجر کی آبیاری کر رہے ہیں وہ اہم نام ہیں علقمہ شبلی، وقار فاطمی، حنیف ترین، شہپر رسول، اعجاز رحمانی، ظفر گورکھپوری، منور رانا، رفعت سروش، راحت اندوری، ملک زادہ منظور احمد، وسیم بریلوی، خالد محمود، شاہد میر، مختار شمیم، ارجمند بانو افشاں، نصرت مہندی، اقبال مسعود، انیس انصاری انیس، ملکہ نسیم، ہما کانپوری وغیرہ وغیرہ۔ ان میں سے اکثر نام وہ ہیں جنھوں نے روایت کی پاسداری کے ساتھ غزل میں نئے لہجے اور نئے موضوعات کے ساتھ ساتھ نئی لفظیات کو بہتر طور پر پیش کیا ہے۔ ان کے علاوہ بھی جو قابل ذکر ہیں ان شعراء کے اشعار بھی تحریر کئے جا رہے ہیں کیونکہ بلاشبہ یہ شعراء حضرات جدید اردو غزل کے سرمایہ میں اضافہ کر رہے ہیں۔ اس لئے ان کے ذکر کے بغیر عصر حاضر کی جدید اردو غزل کی تاریخ نامکمل رہے گی۔ اس مقالے میں اگر کوئی قابل ذکر نام میری کم علمی کی وجہ سے رہ گیا ہو تو اسے درگزر فرمایا جائے۔ اس کے علاوہ میرے کرم فرماں، بزرگ قابل احترام شخصیتیں اور میرے ساتھی جو رائے دیں گے ان کا میں سنجیدگی سے مطالعہ کرونگی اور انشاء اللہ ان سے استفادہ حاصل کروں گی۔

اشعار پیش خدمت ہیں ملاحظہ فرمائیں—

نشہ کرنے کا بہانہ ہوگیا
جب ذرا موسم سہانا ہوگیا

(حنیف ترین)

انجمن ہوں میں کبھی ذات سے اپنی شبلی
اور محفل میں بھی رہ کر کبھی تنہا ہوں میں

(علقمہ شبلی)

لوگ کہتے ہیں کہ تو مجھ کو برا کہتا ہے
میں بھی سن لوں تیرے ہونٹوں کی زبانی کچھ تو

(شہپر رسول)

میں سچ ہوں کسی شہر کے فٹ پاتھ پر ملوں گا
مجھے تلاش! پرانی کتاب والوں میں

(ظفر گورکھپوری)

رنگ لہو لائے گا اک دن مجبوروں مظلوموں کا
ظالم قاتل موج اڑالیں رسّی جب تک ڈھیلی ہے

(اعجاز رحمانی)

نہ روک لے ہمیں روتا ہوا کوئی چہرہ
چلے تو مڑ کے گلی کی طرف نہیں دیکھا

(منور رانا)

پیروں میں بھنور باندھ کے طوفاں سے الجھتی
کشتی کے مقابل کوئی طوفان تو ہوتا

(گلنار آفریں)

تمھارے ساتھ ہمت ہے یقیں ہے عزم محکم ہے
اکیلے بھی چلو گر تم تو خود کو کارواں لکھنا

(رفعت سروش)

جانے کیسے ریل کی پٹری پہ جا کر کٹ گیا
اک بہادر شخص سارے شہر کی جو ناک تھا

(بیکل اتساہی)

یوں تو اس کے دل کی ہر دھڑکن میں میں شامل رہی
ظاہراً یہ تلخ گوئی بے رُخی اچھی لگی

(ارجمند بانو افشاں)

اس نے سب کے بیچ تم کہہ کر مجھے آواز دی
محفلِ اہلِ ادب میں سادگی اچھی لگی

(ارجمند بانو افشاں)

جو پڑھ سکو تو خلوص پڑھ لو میری نگاہوں کی سادگی میں
جہاں میں افشاں سے لوگ کم ہیں ہوں جنکے سچّی کتاب چہرے

(ارجمند بانو افشاں)

اگر چاہوں جھٹک کر توڑدوں زنجیر تنہائی
میں تنکا ہوں مگر موجوں سے ہے میری شناسائی

(ملکہ نسیم)

عرض محبت پر چُپ رہنا ظاہر ہے انکار مگر
شاید وہ کچھ سوچ رہا ہو ایسا بھی ہو سکتا ہے

(ملک زادہ منظور احمد)

وہ سب پہ بوجھ تھا اک شام جب نہیں لوٹا
اسی پرندے کا شاخوں کو انتظار رہا

(وسیم بریلوی)

اے خدا ریت کے صحرا کو سمندر کردے
میری چادر میرے پیروں کے برابر کردے

(شاہد میر)

تیری چاہت ہے آگ کا دریا
ننگے پاؤں اتر رہی ہوں میں

(نصرت مہندی)

اپنی رعنائیاں تجھے دیکر
ریزہ ریزہ بکھر رہی ہوں میں

(نصرت مہندی)

ہم نے کبھی انداز سخن کو نہیں بدلہ
ہر چند بدلتے رہے اس بزم کے حالات

(محسن بھوپالی، پاکستان)

دشوار سے دشوار ہو وہ کام ہمیں دو
سلجھائیں گے ہم گیسوئے ایام ہمیں دو

(وفا صدیقی)

بنتے ہیں محل اب بھی مجبوروں کی لاشوں پر
لیتی ہے خراج اب تک چنگیزیٔ و دارائی

(وفا صدیقی)

موت ہے بارِ غم ہستی سے گھبرانے کا نام
زندگی ہے مسکرا کر زہر پی جانے کا نام

(ارشد صدیقی)

اسیری ہمکو راس آئی نہ آزادی ہی راس آئی
قفس میں خون روتے تھے چمن میں ہاتھ ملتے ہیں

(شفا گوالیاری)

دیکھ کر سوتا ہوا فاقہ زدہ مزدور کو
صبح کے دامن پہ کیا آنسو ڈھلک آیا کوئی

(احسن علی خاں احسنؔ بھوپالی)

تڑپ کر جب کریگی سارے گلشن پر اثر ہوگا
نگاہِ برق کیا محدود میرے آشیاں تک ہے

(وکیل بھوپالی)

ہم اپنے شہر میں محفوظ بھی ہیں خوش بھی ہیں
یہ سچ نہیں ہے مگر اعتبار کرنا ہے

(راحتؔ اندوری)

اسی ایک احساس میں لُٹ گیا
کہ وہ شخص بھی پاسبانوں میں تھا

(مختار شمیم)

ساتھ تیرے ضرور ہم چلتے
کیا کریں جیب اپنی خالی ہے

(محمد انیس انصاری انیسؔ)

اُس کو دل سے بھلاؤں میں کیسے
جو مصیبت میں کام آیا ہے

(محمد انیس انصاری انیسؔ)

یوں ہی نہیں پڑیں ہیں دراریں فصیل میں
لڑتے رہے ہیں میرے سپاہی میرے خلاف

(اقبال مسعود)

اس قدر مت اداس ہو جیسے
یہ محبت کا آخری دن ہے

(اقبال مسعود)

شکستہ سفینہ مسافر نڈھال
تلاطم شب تار بارش ہوا

(خالد محمود)

سوتے سوتے کروٹ لے کر بانس کا پنکھا جھلتے ہیں
بیری ان کو سولینے دے پل دو پل ٹل جاری دھوپ

(خالد محمود)

پھر آئی شام وہ یادوں کے قافلے اُترے
تمام شب ہے سفر کا عذاب آنکھوں میں

(عشرت قادری)

زخموں کا پیڑ ہوں یہ کرم مجھ پہ کیوں نہیں
موسم کو جب لباس بدلنے کا شوق ہے

(ظفر صہبائی)

مبارک مجھ سے میرا دور ہونا
ترے نزدیک آتا جارہا ہوں

(باسط بھوپالی)

سزا گناہوں کی دینا اس کو ضرور لیکن
وہ آدمی ہے، تم اس کی عظمت گھٹا نہ دینا

(قتیل شفائی)

لاکھ قسمت میں غریب الوطنی ہو رہبرؔ
کھینچ لائی ہے مگر پھر بھی محبت گھر کی

(رہبر جونپوری)

حمام کے آئینے میں شب ڈوب رہی تھی
سگریٹ سے نئے دن کا دھواں پھیل رہا تھا

(عادل منصوری)

شعر کہنے کا سلیقہ تو یقیناً بخشا
اے خدا! کیا کوئی رتبہ نہیں دیگا مجھکو

(سیفی سرونجی)

دل کی خیریت کہئے کس کے روبرو جا کر
زخم زخم پھرتا ہے ان دنوں مسیحا تک

(نجیب رامش)

اک خطا پہ آدم نے جو حیات کھوئی تھی
وہ حیات پانے کو یہ حیات لازم ہے

(بدر واسطی)

پھولوں کے سوکھ جانے کا غم تو سبھی کو ہے
یہ بھی کسی کو فکر ہے خوشبو کا کیا ہوا

(بدر واسطی)

سیدھے زمیں پہ دھوپ کے نیزے جھکے ہوئے
سایہ ہمارے پاؤں میں سر ڈالتا ہوا

(نور محمد یاس)

سمندروں پہ اجارہ ہے جنکا ناخوش ہیں
کہ لوگ ریت پہ کیوں کشتیاں چلانے لگے

(آفتاب عارف)

کچھ لوگ تھے بضد کہ کبھی کھل کے بھی ملو
کھل کر ملے تو رسمِ ملاقات بھی گئی

(اختر وامق)

ہمیں تو اپنے جذبوں کی زباں ہی یاد رہتی ہے
نہ پنجابی سمجھتے ہیں نہ گجراتی سمجھتے ہیں

(فاروق انجم)

لائے تھے لوگ چاند ستاروں کی پیشکش
میں نے ضمیر بیچ کے سودا نہیں کیا

(ظفر نسیمی)

پڑا ہے بال تو بس میرے آبگینے میں
خیال خاطر احباب پر نہیں آیا

(وحید پرواز)

قدم قدم میرا بیٹا جوان ہوتا ہے
نفس نفس میرے کاندھے سے دھوپ ڈھلتی ہے

(رشید امکان)

# منتخب اشعار۔ ڈاکٹر راحت بدر

کیوں نہیں دیتی ہے فرصت ایک لمحہ زندگی
رات کی تنہائیوں میں لو لگانے کے لئے

☆

آب پینے کو بھی نہیں ملتا
پیڑ کیسے بڑے ہوئے ہونگے

☆

ان کے آنے کی جب خبر آئی
زرد پتے ہرے ہوئے ہونگے

☆

رُک گئے کیوں جنگل میں قافلے پرندوں کے
آندھیوں کا کہنا تھا پہلے ہم گذر جائیں

☆

دل دعا یہ کرتا ہے آج کی نئی نسلیں
سچ کے پھول لے جائیں وہ جہاں جدھر جائیں

وقت کتنی تیزی سے پر لگا کے اڑتا ہے
وقت کے پکڑنے کو کون سا ہنر لائیں

☆

ترس گئے آج گھر کو اپنے
جلایا جڑیوں کا گھونسلہ تھا

☆

اسے تنہائی کا غم کھا رہا ہے
جو میرا دل بہت بہلا رہا ہے
بہت سے دوستوں کا ساتھ لیکن
اکیلا پن اسے تڑپا رہا ہے

☆

ہو سکا نہ وہ مشہور اک عمر میں
اس کی جیبوں میں شہرت بھری رہ گئی

☆

کیسے کیسے حسین خوابوں سے
اُجڑا آنگن سجا رہی ہوں میں
سات رنگوں تم ایک ہو جاؤ
رنگ اپنا بنا رہی ہوں میں

☆

زندگی کی سب کتابیں پڑھ کے اس نے دیکھ لیں
کون کتنا جانتا ہے وقت ہی بتلائے گا

☆

کس نے وفا میں عمر گزاری
تم کیا سمجھو اس کا راز
جیسے ہی وہ سامنے آئے
بج اٹھتا ہے دل کا ساز

☆

شام ہی کو گیس نے حملہ کیا تھا شہر پر
دوسرے دن آدمی بے گھر نظر آنے لگے

☆

میں ان کے واسطے کچھ بھی نہ کر سکی اے دل
جو میری فکر میں نیندیں حرام کرتے ہیں

## غزل

آپ کے حُسن کا جواب نہیں
دوسرا کوئی انتخاب نہیں
تنکے چُن چُن کے گھر بناتی ہیں
ان کی محنت کا کچھ حساب نہیں
دھوپ سر پر اٹھائی تب سمجھے

زندگی عشق کی کتاب نہیں

پیاس لوگوں کی وہ بجھاتے ہیں
اس سے بڑھ کر کوئی ثواب نہیں

پہن کر وہ حجاب پھرتی ہیں
ان کے چہروں پہ کیوں حجاب نہیں

مل گیا نام ''بدرؔ'' راحت کو
اس سے بہتر کوئی خطاب نہیں

# جدید غزل کا فنّی مطالعہ

# موضوعات، لفظیات اور طرز بیان

## غزل کا فن:

تین سو برس سے اب تک اردو غزل کے اسلوب میں برابر تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں لیکن اس کی بنیادی حقیقت میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوا۔ اس سے صاف طور پر یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ صنف سخن اپنی اصلی حیثیت کو برقرار رکھتے ہوئے مختلف حالات سے مطابقت کی صلاحیت رکھتی ہے۔ غزل ایک ایسا فن ہے جس میں اختصار کے ساتھ حیات و کائنات کے رمز بیان ہو سکتے ہیں۔ عام طور سے غزل کا ایک شعر ایک اکائی ہوتا ہے۔ غزل نے اپنی توانائی کا ثبوت دیا کہ آج بے شمار زبانوں میں غزل لکھی جا رہی ہے اور ہندی میں مقبول شعراء کے کلام کے ترجمے ہو رہے ہیں۔

غزل میں شاعر چھوٹی چھوٹی بات سے لے کر بڑے سے بڑے تجربے، فلسفۂ حیات، و کائنات اور طویل داخلی جذبات، سماجی سیاسی، تاریخی تحقیقی وغیرہ سبھی کچھ صرف دو مصرعوں میں بیان کر دیتا ہے، مثلاً:

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے

(غالب)

قیدِ حیات بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

(غالبؔ)

غزل کا حسن اس کے اختصار میں ہے اور اختصار سے بات کہنے کے لئے شاعر رمزیت ایمائیت تشبیہ واستعارے کے ساتھ تلمیح سے بھی کام لیتا ہے۔

غزل کا فن مخصوص بحروں کا پابند ہے، یعنی مطلع میں شاعر جو وزن پہلے مصرعے میں طے کردے گا وہ پوری غزل (یعنی مطلع، اشعار اور مقطع سب کے پہلے اور دوسرے مصرعے، مطلع کے پہلے مصرعے کی حد نہیں توڑ سکیں گے) میں رہے گا، مثلاً:

چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے
ہم کو اب تک عاشقی کا وہ زمانہ یاد ہے

(حسرت)

اس مطلع میں ''یاد ہے'' جو دونوں مصرعوں میں آیا ہے۔ غزل کے اگلے شعروں میں پہلا مصرعہ ''یاد ہے'' سے آزاد رہے گا اور دوسرے مصرعے میں ''یاد ہے'' آتا رہے گا۔ اس کو ردیف کہتے ہیں اور قافیہ (یعنی بہانہ، زمانہ) بدلتا رہتا ہے اور اس کا وزن اور آہنگ ایک رہتا ہے۔ غزل کا آخری شعر جس میں شاعر کا تخلص آجائے اسے مقطع کہتے ہیں۔ قدیم شعراء کے یہاں مقطع کہنے کا اہتمام لازمی تھا لیکن اب موجودہ دور میں شعراء ہر غزل میں مقطع نہیں کہتے اور زیادہ تر مشہور اور صاحب طرز شعراء کی غزلیں ان کے اسلوب سے ہی پہچان لی جاتی ہیں۔

غزل میں تغزل کا ہونا بہت ضروری ہے جس طرح زندگی کے لئے جسم میں

روح ضروری ہے۔ تغزل کے بغیر غزل بے روح اور بے جان ہے۔ غزل میں ہجر و وصال کے قصے، حسن و عشق کی داستان، غمِ روزگار، خوشیاں اور یاس و حرماں نصیبی تمام موضوع نظر آئیں گے لیکن غزل کے شعر کی خاص خوبی یہ ہے کہ اس میں کھل کر صاف کہنے کے بجائے علامات کی مدد سے بات کہی جاتی ہے۔ ہلکا سا ابہام اور خلاء سامع کو پورا کرنے کے لئے چھوڑ دیا جاتا ہے۔

## جدید غزل کا فنّی مطالعہ :

غزل ہماری کئی سو سالہ شاعری کی سب سے محبوب صنف ہے اور تعجب خیز بات یہ ہے کہ ہندوستان اور پاکستان بننے سے پہلے اور اس کے بعد بھی کچھ عرصے تک غزل کے اہم اور بڑے شاعر فراقؔ گورکھپوری، جگر مرادآبادی، اصغر گونڈوی بجا طور پر اس عہد میں مانے گئے۔ اس کے آگے ترقی پسند تحریک کے انقلاب آفریں شاعر فیض احمد فیض، سردار جعفری، مجروح سلطانپوری، کیفی اعظمی اور اختر سعید خاں نے غزل کا پورا پورا حق ادا کیا۔ بدلتے ہوئے وقت کی ترجمانی کی۔ سردار جعفری اور فیض احمد فیض جیسے انقلابی شاعروں کے یہاں غزل کی تمام عصری وسعتیں اور مفہوم پیدا کرنے کا حوصلہ رفتہ رفتہ تخلیقی رنگ اختیار کرتا گیا اور اس وقت بہت سے شاعر ایسے بھی تھے جنھوں نے گرم گفتاری سے کام لیا۔ محبت کے ساتھ ساتھ مختلف سیاسی سماجی مسائل کو غزل میں پیش کیا۔ جہاں تک جدید غزل کے لفظیات کا سوال ہے تو اردو زبان نئے ہر ملکی اور غیر ملکی زبان سے کارآمد الفاظ بر وقت قبول کئے اور شعراء حضرات نے ان کو اپنی غزلوں میں باندھنے کی کوشش کی ہے۔ بیسویں صدی میں اس عہد کی ادبی اردو میں جو تنقیدی مضامین ناول اور افسانے لکھے گئے ان کے ذریعہ سے بول چال کی زبان جس میں انگریزی، ہندی اور

علاقائی زبانوں کے الفاظ اردو میں شامل ہوتے گئے۔ مثال کے طور پر کوئی ناول یا افسانہ لیں تو اس کو پڑھنے پر آسانی سے ہیرو، ہیروئن، پلاٹ، کیریکٹر، ریل، کالر، بٹن وغیرہ الفاظ مل جائیں گے لیکن عام طور پر غزل میں نہیں ملتے تھے۔ اس لئے جب ۶۱-۱۹۶۰ میں رسالہ کتاب لکھنؤ میں بشیر بدر کا یہ شعر شائع ہوا:

وہ زعفرانی پلوور اسی کا حصہ ہے
کوئی جو دوسرا پہنے تو دوسرا ہی لگے

تو اکثر ادیبوں کا یہ اعتراض تھا یہ بلا وجہ انگریزی لفظ (Pullover) غزل میں لایا گیا ہے اور اس سے غزل کا مزاج مجروح ہوتا ہے۔ حالانکہ اس پر بھی چند ہی برس کے اندر اردو غزل میں ایسے بے شمار انگریزی کے لفظ آ گئے تھے جن کا اردو ہندی کرنا مشکل نظر آرہا تھا۔ خاص طور سے ایسے الفاظ مثلاً ٹکٹ، گلاس، اسکول، فون وغیرہ یہ الفاظ عام بول چال کی ہندی اردو میں شامل ہو چکے تھے۔ اس سلسلے میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے اساتذہ پروفیسر آل احمد سرور اور ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی کی تنقیدوں کا متوازن رویہ بھی بڑا حوصلہ افزا رہا۔ ان لوگوں نے اپنی غزل کی تنقید میں اس وقت کے نئے شاعر ناصر کاظمی، ظفر اقبال، بشیؔر بدر، محمد علوی وغیرہ وغیرہ کی غزلوں کو ایم اے اردو کے خصوصی پرچے کے نصاب میں شامل کر دیا۔ اور اس عہد کے یہ اشعار کلاس میں موضوع بحث بنے۔

کھلے سے لان میں سب لوگ بیٹھیں چائے پئیں
دعا کرو کے خدا ہم کو آدمی کر دے

(بشیؔر بدر۔ علی گڑھ میگزین)

میں اتنا بدمعاش نہیں یعنی کھل کے بیٹھ
چبھنے لگی ہے دھوپ سوئٹر اتار دے

(ظفر اقبال۔ پاکستان، رسالہ ''صبا'' ۱۹۶۸ء منتخب شاعری)

اس نے ٹیلیفون کیا ہے اور کسی کے ساتھ ہے
میرا اس کا سمجھوتا ہے کون بڑھائے بات کو

(ساقی فاروقی۔ ''فنون'' کراچی)

ناصر کاظمی ظفر اقبال وغیرہ نے پاکستان میں اور محمد علوی، بشیر بدر اور ساقی فاروقی وغیرہ نے ہندوستان میں جس کثرت سے انگریزی الفاظ کو اردو غزل میں استعمال کیا ان کو دیکھ کر کئی دوسرے شعراء نے بھی کوشش کی۔ ابھی تک غزل اُس عورت اور مرد کا عشق تھی جس کے درمیان کبھی زمانہ آجاتا تھا اور کبھی مذہب لیکن یہ مسئلہ نہیں آیا تھا کہ ایک شادی شدہ عورت مرد سے عشق کر سکیں پھر ہمیں رسالہ ''فنون'' لاہور جولائی ۱۹۶۹ء میں ظفر اقبال کا یہ شعر ملتا ہے:

آیا تھا گھر سے ایک جھلک دیکھنے تیری
میں کھو کے رہ گیا تیرے بچوں کے شعور میں

(ظفر اقبال)

بشیر بدر کو اس سلسلے میں جو تجربہ ہوا اس کو رسالہ تحریک ۱۹۷۱ء میں شائع کیا گیا:۔

اکثر شراب پی کر پڑھتی تھی وہ دعائیں
ہم ایک ایسی لڑکی کے ساتھ رہ رہے تھے

(بشیر بدر)

اردو شاعری میں دوسرے جنم کا ذکر بشیر بدر کے یہاں ایک مکمل فلاسفی کے ساتھ آیا ہے۔ یہ مسئلہ آج کی جدید زندگی اور جدید دنیا کا مسئلہ ہے جو اس شعر میں بیان کیا گیا ہے۔

اب ملے ہم تو کئی لوگ بچھڑ جائیں گے
انتظار اور کرو اگلے جنم تک میرا

ظفؔر اقبال اور بشیؔر بدر کے ان شعروں کا تخلیقی اثر یہ ہوا کہ ساقی فاروقؔی نے بھی اپنے رنگ میں یہ شعر کہا:

اس نے ٹیلیفون کیا ہے اور کسی کے ساتھ ہے
مراس کا سمجھوتہ ہے کون بڑھائے بات کو

(ساقؔی فاروقی)

دراصل اس دور میں غزل نے بہت بڑا تقلیدی عربی اور فارسی کا دائرہ توڑا اور عشق حقیقی کے ساتھ آج کی زندگی کے معمولی مسائل کو بھی محبت میں شامل کرلیا۔ آج کا نوجوان جس ذہنیت اور سوچ کو لے کر آگے بڑھ رہا ہے اس میں ان نوجوانوں کی تعداد زیادہ ہے جو کم تعلیم یافتہ ہیں۔ خلوص محبت اور قربانی کا مطلب نہیں سمجھتے اور ایک ہی وقت میں دوہری زندگی جینا چاہتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لئے ہی یہ شعر شاعر نے لکھا ہے:

مرے بستر پہ سو رہا ہے کوئی
میری آنکھوں میں جاگتا ہے کوئی

(بشیر بدر۔ رسالہ کتاب لکھنؤ ۱۹۶۹ء)

ایسا نہیں ہے کہ صرف ہندوستانی شعراء کا ہی یہ رویہ رہا بلکہ خاص طور پر لاہور

اور کراچی کے رسائل سے ایسے شعر پیش ہیں جن میں عظیم اور قدیم غزل کے معیار پر غیر غزلیہ الفاظ اور خاص طور سے انگریزی کے الفاظ آئے تھے۔

تکمے کھلے ہوئے کسی کالی قمیض کے

بوٹے بنے ہوئے کسی بے رنگ شال پر

(ظفر اقبال۔ ''فنون'' پاکستان)

ہندوستان اور پاکستان میں جو قابل ذکر شاعر ہیں وہ سب جدید غزل کے ارتقائی سفر میں شامل نظر آتے ہیں۔ ان میں محبت انسانیت اور شرافت کی کوئی کمی نہیں ہے، لیکن وقت، حالات اور زمانہ جس وسیع اور معنویت کے ساتھ انسان کی زندگی میں آتے ہیں اسے آخری فیصلہ سمجھ کر پوری زندگی دیوانہ وار گزارنا ایک طرح سے آج کے دور میں گناہ ہے۔ وقت، انسان، محبت، ایثار ان کی آمیزش سے زندگی ہمیشہ آگے بڑھتی رہتی ہے۔ حادثوں کے زخم بھرتے جاتے ہیں اور زندگی میں نئے نئے پھول کھلتے جاتے ہیں۔

کتاب '' آزادی کے بعد غزل کا تنقیدی مطالعہ'' میں بشیر بدر نے صفحہ ۲۸۱ پر لکھا ہے:

''اب محبت صرف اپنے آپ میں جلنے، دور بیٹھنے اور روحانی تہذیب ہی کا نام نہیں ہے، بلکہ عورت اور مرد، روح اور جسم کا مکمل اتصال چاہتے ہیں۔ یہ عورت اور مرد فرشتے نہیں ہیں اپنے ساتھیوں سے بے وفائی بھی کر سکتے ہیں۔''

آج شاعری کسی مخصوص دائرے کے اندر نہ رہ کر زندگی کی ترجمان ہوتی جا

رہی ہے۔ ۱۹۶۰ء کے آس پاس ہندوستان اور پاکستان کی غزل میں، ادب اور ادبی فیشن میں نمایاں تبدیلیاں ہوئیں۔ ترقی پسند (مارکسی) دور میں ایک سے ایک ہندو اور مسلمان شاعر پہلے ترقی پسند نظر آتا تھا بعد میں ہندو مسلمان سکھ عیسائی نظر آتا تھا لیکن یہی ترقی پسند لوگ اپنے غیر مذہبی خیالات کو جسے وہ زندگی کا سچا نظریہ سمجھتے تھے اسکو مے، میخانہ، قید، قفس، مقتل ان سب سے تو تشبیہ دے دیتے تھے لیکن اس کا مفہوم حالیہ نظریات ہوتا تھا اور ان کے اور پرانے شاعروں کے درمیان فرق یہ ہوتا تھا کہ ساقی، محبوب اور اس طرح کے کئی استعارے تھے جو پرانے شاعر تک اپنی دنیاوی زندگی کو انھیں لفظیات سے کتنے الگ الگ معنی میں استعمال کرتے تھے۔ مثلاً جس طرح ساقی شراب پلانے والے کو کہتے ہیں، لیکن کبھی اسی ساقی کے استعارے کو مذہبی بزرگ کی علامت بنا دیا ہے یہاں تک کہ کئی شعراء نے ساقی کا استعمال نعتوں میں رسولِ پاکؐ کے لئے کیا ہے اور بے شمار شعروں میں میخانہ دنیا کو کہا گیا ہے اس کے ساتھ ساقی کو خدا کی طرف اشارہ کیا گیا تھا۔ اس کی غالباً وجہ یہی تھی کہ غزل اپنی تمام روایتوں کے ساتھ عربی اور فارسی سے آئی ہے اور اس کی بحریں آج تک عربی اور فارسی کی ہیں۔

اب اسے دار پہ لے جا کے سلا دے ساقی
یوں بہکنا نہیں اچھا تیرے دیوانے کا

(فانی)

میخانۂ ازل میں، جہانِ خراب میں
ٹھہرا گیا نہ ایک جگہ اضطراب میں

(اصغر گونڈوی)

کئی ترقی پسند شاعروں نے مارکسی نظریۂ حیات کو مانا جہاں خدا اور مذہب کا کوئی تصور نہیں ہے لیکن ۱۹۶۰ء کے آس پاس جسے ہم جدید غزل کا دور کہیں وہ عربی، فارسی اور اردو کی اس غزل سے جس کے کلیدی الفاظ کئی سو برس سے محفوظ تھے وہ ناصر کاظمی اور ان کے بعد کے شاعروں نے دھیرے دھیرے پرانے لفظیات سے جان بوجھ کر اجتناب کیا اور عام طور پر بولی جانے والی زبان میں غزل کہنے کی کوشش کی، یہ کوئی آسان کام نہیں تھا۔

دراصل عام آدمی جو دنیا کو تو پڑھ رہا تھا لیکن اسکول میں تعلیم حاصل نہیں کی وہ دوسری زبانوں کے کئی الفاظ کو اپنی مادری زبان کا ہی سمجھنے لگا اور ان کا استعمال بھی روانی کے ساتھ ہونے لگا۔

یہ اور بات آنکھیں مٹی سے بھر گئیں ہیں
دیکھتے ہیں چند چہرے جاتی ہوئی بسوں پر

(شہزاد احمد فنون)

صبح کاذب کی ہوا میں درد تھا کتنا منیؔر
ریل کی سیٹی بجی تو دل لہو سے بھر گیا

(منیؔر نیازی۔ فنون جدید غزل نمبر)

جانے کیوں آج میرے شہر کے اسٹیشن پر
میرے ہی پاؤں اترنے نہیں دیتے مجھ کو

(قمر اقبال)

یہاں لباس کی قیمت ہے آدمی کی نہیں
مجھے گلاس بڑے دے شراب کم کردے

(بشیر بدر۔ اکائی)

آتی ہوئی ٹرین کے آگے جو رکھ گئی
اس ماں سے یہ نہ کہنا ابھی تک حیات ہوں

(بشیر بدر۔ اکائی)

ایسے انگریزی زبان سے آئے ہوئے بہت سے الفاظ غزل میں گھل مل گئے کیوں کہ وہ ہر خاص و عام کی بول چال کا حصّہ بن گئے تھے۔ یہ تبدیلی بہت فطری تبدیلی تھی لیکن غزل کی روایت اتنی مضبوط تھی کہ رگھوپتی سہائے فراقؔ جیسے انگریزی کے پروفیسر اور اردو کے عظیم شاعر تک کسی کی ہمت نہیں ہوئی کہ مغربی زبان سے آئے ہوئے لفظ جو اردو، ہندی بن رہے ہیں انھیں غزل میں شامل کریں کیوں کہ غزل کی چلی آرہی روایات کو توڑنا آسان کام نہیں تھا یہ ہمت جگر اور فراقؔ تو نہیں کر سکے لیکن ان کے سامنے ہی آنے والی نسل نے اس میں تبدیلی لانے کی کوشش کی۔ آج کے نمائندہ جدید غزل کے شعراء جن کے یہاں یہ تبدیلی ممکن ہوسکی ان میں ناصرؔ کاظمی، ابن انشاؔء، بشیرؔ بدر، محمد علوی، شہزاد احمد وغیرہ کے نام نمایاں ہیں۔

خلیل الرحمٰن اعظمی کے یہاں ایسے اشعار مل جاتے ہیں جو پرانی لفظیات میں نئے شعر کہتے ہیں جب کہ انھوں نے اس وقت اپنی غزلوں میں انگریزی الفاظ کا استعمال نہیں کیا لیکن سہل زبان میں شاعری کی۔ استاد ہونے کے ناطے انہوں نے اس وقت کے طالب علم شہریار اور بشیر بدر پر خاص توجہ دی اور ان کے نئے رنگ کی پاسداری کی۔

خلیلؔ الرحمٰن اعظمی کا یہ شعر ملاحظہ ہو:

آج آئینہ جو دیکھا تو ہوا یہ محسوس
جانے یہ کون ہے؟ میں ایسا تھا؟ یہ میں تو نہیں

ناصرؔ کاظمی کے بعد پاکستان میں منیر نیازی جدید اور اہم ترین شاعر ہیں۔ عمر میں ناصر کاظمی سے چھوٹے تھے لیکن ان کے جدید رویّوں کی تعریف کرتے وقت یہ اشارہ بھی لازمی ہے کہ انھوں نے ناصرؔ کے شعری آہنگ اور شعری مزاج کو برقرار رکھتے ہوئے اسے آگے بڑھایا اور نئے دور سے ہم آہنگ کر دیا، مثلاً:

تھکے لوگوں کو مجبوری میں چلتے دیکھ لیتا ہوں
میں بس کی کھڑکیوں سے یہ تماشہ دیکھ لیتا ہوں

(منیر نیازی)

ابن انشاء اور ناصر کاظمی بہت دوست بھی تھے۔ ابن انشاء نے غزل کے ساتھ نئی نظمیں بھی لکھیں۔ وہ نئی نظم کے بھی بہت اہم شاعر ہوئے۔ شاعری آج کی زبان میں کی اور ایسے شعر کہے جو عام لوگوں کو اپنے دل کی بات معلوم ہوئے۔ مثلاً:

اس شہر میں کس سے ملیں ہم سے تو چھوٹیں محفلیں
ہر شخص تیرا نام لے ہر شخص دیوانہ تیرا

(انشاء)

احمد فراز، محمد علوی، بشیر بدر، ندا فاضلی، شہریار وغیرہ ایک ہی صنف میں شمار کئے جاتے ہیں۔ ناصر کاظمی ان سب کے سینئر شاعر تھے۔ ناصرؔ کاظمی کی غزلوں اور ابن انشاؔء کی نظموں سے یہ رجحان جدید شعراء حضرات میں عام ہوا کہ ہر سچے شاعر کو اپنا

اسلوب تلاش کرنا چاہئے۔ ایک وقت ایسا تھا جب شہریار اور بشیؔر بدر ایک جگہ اور ایک ہی شہر یعنی علی گڑھ میں موجود تھے اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں پڑھا رہے تھے۔ لیکن شاعری کا اسلوب جدا جدا تھا۔ شہریار نے موجودہ حالات کو دریا کی تنک مزاجی سے ظاہر کیا ہے ان کے اشعار میں اکثر انسان کے گرم اور ٹھنڈے مزاج کو دریا کے اتار چڑھاؤ سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ عام انسان کی تکلیفوں اور پریشانیوں کو محسوس کر کے لکھتے ہیں:

سینے میں جلن آنکھوں میں طوفان سا کیوں ہے
اس شہر میں ہر شخص پریشان سا کیوں ہے

(شہؔریار)

دریا چڑھتے ہیں اُتر جاتے ہیں
حادثے سارے گزر جاتے ہیں

(شہؔریار)

بشیؔر بدر کی شاعری اور ان کے اسلوب کا انسان کے انفرادی وجود اور سماج کے اجتماعی وجود سے بہت ہی گہرا رشتہ ہے اور یہی وہ رشتہ ہے جس نے بشیؔر بدر کی شاعری کو عوام کے دلوں کی دھڑکن بنا دیا۔ اُن کے اشعار میں وہ انسانی جذبے، تجربات اور احساسات موجود ہیں جن کو پڑھ کر اپنے جذبے اور احساس کا عکس نظر آنے لگتا ہے۔ غزل کو انھوں نے رومانی حسن سے بخوبی سنوارا ہے۔ ان کے اشعار کا سفر نظر سے ذہن اور ذہن سے سیدھا دل کی طرف ہوتا ہے۔ سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ شعر کو سمجھنے اور یاد رکھنے کے لئے ذہن کو مشقت نہیں کرنا پڑتی۔ عام بول چال کی زبان میں بڑی سے بڑی بات بڑی خوش اسلوبی سے کہہ لیتے ہیں یہی ان کی شاعری کا اصل کمال ہے۔ موجودہ

حالات کی سچائی بڑی سادگی سے بیان کر جاتے ہیں:

کوئی ہاتھ بھی نہ ملائے گا جو گلے ملو گے تپاک سے
یہ نئے مزاج کا شہر ہے ذرا فاصلے سے ملا کرو

☆

کچھ تو مجبوریاں رہی ہوں گی
یوں کوئی بے وفا نہیں ہوتا

☆

رونے والوں نے اٹھا رکھا تھا گھر سر پہ مگر
عمر بھر کا جاگنے والا پڑا سوتا رہا

☆

مختصر باتیں کرو بے جا وضاحت مت کرو
یہ نئی دنیا ہے بچوں میں ذہانت ہے بہت

☆

دشمنی جم کر کرو لیکن یہ گنجائش رہے
جب کبھی ہم دوست ہو جائیں تو شرمندہ نہ ہوں

غزل میں روایتی موضوعات کے ساتھ ساتھ نئے رجحانات خیالات اور موضوعات ترقی پسند تحریک کے زیر اثر آنا شروع ہو گئے تھے۔ مثلاً:

مجھے سہل ہو گئیں منزلیں کہ ہوا کے رُخ بھی بدل گئے
ترا ہاتھ ہاتھ میں آ گیا کہ چراغ راہوں میں جل گئے

(مجروحؔ)

ہم ہیں متاعِ کوچۂ بازار کی طرح
اٹھتی ہے ہر نگاہ خریدار کی طرح

(مجروح)

ان موضوعات میں تقسیم ہند نے ایک نیا باب جوڑ دیا۔ ۱۹۴۷ء کی تقسیم کے بعد اردو بھی تقسیم ہوئی لیکن ہندوستان اور پاکستان میں اردو رسائل اور ادبی کتابوں کا لین دین بند نہیں ہوا۔ پاکستانی رسائل نقوش لاہور، سویرا لاہور، نیا دور کراچی، نئی قدریں، حیدرآباد سندھ کے شمارہ ہندوستان میں بے روک ٹوک آتے رہے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے علاوہ ہندوستان کی بڑی یونیورسٹیوں کے شعبہ اردو میں آج بھی پاکستانی رسائل کی جلدیں دستیاب ہوجاتی ہیں۔

ہندوستانی رسائل جو بظاہر اپنی تمام عظمتوں کے ساتھ پردہ پوش زوال سے دو چار ہو رہے تھے ان میں نیاز فتح پوری کا ''نگار'' علامہ سیماب اکبرآبادی، ان کے بیٹے اور آخر میں پوتوں کا رسالہ ''شاعر'' ممبئی اور ہندوستانی سرکاری پرچے مثلاً ''آج کل'' دہلی اور کچھ دنوں بعد ''نیا دور'' لکھنؤ ان تمام تبدیلیوں کا پتہ بھی دیتے ہیں جن سے ہمارے دور کی شناخت ہوتی ہے۔

ہندوستان اور پاکستان بننے میں جو تبدیلیاں اچانک آئیں ان کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ ہندوستان جیسا بڑا ملک بظاہر ایک خوشگوار تبدیلی سے سرفراز ہوا یعنی انگریزوں کی غلامی سے نجات پا کر آزاد ہو گیا یہ آزادی اپنی تمام برکتوں اور عظمتوں کے ساتھ جو مسائل اور شکست و ریخت لائی اس کا اندازہ آج کی نئی نسل آسانی سے نہیں کر سکتی۔ اتنا بڑا ملک تین حصّوں میں تقسیم ہو گیا۔

۱۔ آزاد ہندوستان

۲۔ آزاد مغربی پاکستان

۳۔ آزاد مشرقی پاکستان

تاریخ کے صفحات بتاتے ہیں کہ آزدی جیسی بڑی نعمت کا جشن چاروں طرف منایا جارہا تھا کہ فسادات بڑے پیمانے پر پھوٹ پڑے۔ اس خون ریزی، قتل و غارت گری، لوٹ مار کا اندازہ آج کا عام انسان کر ہی نہیں سکتا۔ ہندوستان کے چاروں طرف چھوٹے بڑے شہروں میں ہندو مسلم فساد آگ کی طرح پھیل گئے۔ یہی حالت لاہور، کراچی اور دوسرے چھوٹے بڑے شہروں میں ہوئی۔ مشرقی پاکستان سے بھی ایسی خبریں اخبار کی سرخیاں بننے لگیں۔ ترک وطن کا عمل انسانی تباہی کے اس سیلاب کی طرح تھا جس کا اندازہ ہندوستان اور پاکستان کے وہ مجاہدین آزادی کبھی سوچ ہی نہیں سکتے تھے جو اپنی جان و مال لٹا کر انگریزوں سے آزادی کی جنگ لڑ رہے تھے اور اپنا سب کچھ قربان کر کے غلامی کی زندگی سے آزاد ہوکر آزاد ہندوستان اور آزاد پاکستان کا جشن منانے والے تھے۔ چاروں طرف ہندو مسلم فسادات کی ایسی آگ لگی کہ اس وقت کے لیڈر اور اس وقت کے شاعر اور ادیب پہلے سے اس تیز رفتار تباہی اور خوں ریزی کا پوری طرح سے اندازہ بھی نہیں کر سکتے تھے۔

ہم دیڑھ سو سال کی غلامی کاٹ کر آزادی کی خوشی منانے والے تھے مگر چاروں طرف فسادات کی تباہیاں تھیں سارے اخبارات اور ریڈیو تعمیری لہجہ اور رویہ بھول گئے تھے۔ انسان انسان کا دشمن ہورہا تھا، چاروں طرف خوں ریزی تھی۔ کبھی خبر آتی تھی کہ لاہور سے آنے والی ٹرین آگ اور خون سے لبریز ہوگئی۔ وہیں شاعر اور ادیب جو انگریزی سے نجات پا کر خوشی سے بھرپور غزل لکھنا چاہتے تھے انھیں کے قلم اس بھیانک

حقیقت کا پتہ دے رہے تھے۔ مثال کے طور پر یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

کہیں اُجڑی اجڑی سی منزلیں کہیں ٹوٹے پھوٹے سے بام و در
یہ وہی دیار ہے دوستوں جہاں لوگ پھرتے تھے رات بھر

(ناصرؔ کاظمی)

دیکھا اُنھیں قریب سے ہم نے تو رو دئے
جن بستیوں کو آگ لگانے چلے تھے ہم

(خورشید الاسلام)

میں بھٹکتا پھرتا ہوں دیر سے یوں ہی شہر شہر نگر نگر
کہاں کھو گیا میرا قافلہ کہاں رہ گئے میرے ہم سفر

(ناصرؔ کاظمی)

ہر خرابہ یہ صدا دیتا ہے
میں بھی آباد مکاں تھا پہلے

(ناصرؔ کاظمی)

مجھکو ان سچّی باتوں سے اپنے جھوٹ بہت پیارے ہیں
جن سچّی باتوں سے صدیوں انسانوں کا خون بہا ہے

(بشیرؔ بدرؔ)

مجھے دیا نہ کبھی میرے دشمنوں کا پتہ
مجھے ہوا سے لڑاتے رہے جہاں والے

(ظفرؔ اقبال)

کیاریاں دھول سے اٹی پائیں
آشیانہ جلا ہوا دیکھا

(ناصر کاظمی)

فاختہ چپ ہے بڑی دیر سے کیوں
سرو کی شاخ ہلا کر دیکھو

(ناصرؔ کاظمی)

کیوں چمن چھوڑ دیا خوشبو نے
پھول کے پاس تو جا کر دیکھو

(ناصر کاظمی)

دیکھو تو فریب موسمِ گل
ہر زخم پر پھول کا گمان ہے

(باقی صدیقی)

بس دیکھ چلی دنیا یہ بزم فروزی بھی
رکھا ہے چراغ ایسا جلتا ہے نہ بجھتا ہے

(نشور واحدی)

زندگی اتنی بھی بے درد نہ تھی
آگہی بول کہاں ہیں ہم لوگ

(خاطر غزنوی)

گزر رہا ہوں مسلسل کچھ ایسے عالم میں
حیات دے کے مجھے جیسے کوئی بھول گیا

(سلیمان ادیب)

محفل انسان میں کیوں بے رونقی پاتا ہوں میں
زندگی خالی ہے اور دنیا بھری پاتا ہوں میں

(نشور واحدی)

آہٹیں چلمنوں سے پوچھتی ہیں
قید کب تک رہیں گے ہم بابا

(بشیر بدر۔ سویرا، لاہور)

کوئی ہاتھ نہیں خالی ہے
بابا یہ کیسی نگری ہے

☆

سناٹے کی شاخوں پر کچھ زخمی پرندے ہیں
خاموشی بذاتِ خود آواز کا صحرا ہے

(بشیر بدر۔ رسالہ نقوش ۱۹۹۸ء)

ساری دنیا ہمیں پہنچانتی ہے
کوئی ہم سا بھی نہ تنہا ہوگا

(احمد ندیم قاسمی)

آدمیت کس قدر مایوس ہے
جیسے کوئی آدمی باقی نہیں

(صبا اکبر آبادی جولائی ۱۹۵۸ء رسالہ ادب لطیف)

اجنبی شہر لوگ نہ مانوس
کیا سنے کوئی کیا کہے کوئی

(ناصر کاظمی۔ نیا دور، کراچی)

بستیاں دور ہوئی جاتی ہیں رفتہ رفتہ
دم بدم آنکھوں سے چھپتے چلے جاتے ہیں چراغ

(احمد فراز۔ ادب لطیف)

ایک تنکے کی طرح ہیں ہم لوگ
وقت کے بہتے ہوئے دریا میں

(محمد علوی۔ سویرا، لاہور)

کب جانے ہوا اس کو بکھرا دے فضاؤں میں
خاموش درختوں پہ سہما ہوا نغمہ ہے

(بشیر بدر۔ رسالہ نقوش، لاہور)

تقسیم ہندو پاک کے اس عہد میں سارے اخبارات، ریڈیو ایسی ہی تباہیوں کی اطلاعات نشر کرتے تھے اس وقت بھی آمد و رفت کا سلسلہ اور رسائل کا تبادلہ قانونی طور پر استوار رہا۔

یہاں کے بڑے بڑے شاعر (فراق، جگر، اثر لکھنوی وغیرہ) پاکستان کے اہم ترین رسائل (مثلاً نقوش لاہور، سویرا لاہور، نیا دور کراچی) میں بڑی شان سے شائع ہوتے رہے اور ایسے بڑے شاعر مانے جاتے رہے کہ ان کی ہر اشاعت پر حصہ غزل جگر یا فراق سے ہی شروع ہوتا تھا۔ شاید اسی لئے کراچی لاہور، دلی اور علی گڑھ کے شعبۂ اردو نے جدید غزل کو ہندوستان اور پاکستان کی غزل میں تقسیم نہیں کیا۔ مشرقی پاکستان پر بنگالی زبان و کلچر پوری طاقت سے انفرادیت پر زور دیتا رہا۔ بلا آخر وہ پاکستان سے الگ ہوکر بنگلہ دیش ہوگیا۔ کراچی، لاہور، دلّی، لکھنؤ کی زبان تقریباً وہی اردو رہی جسے ہم بیسویں صدی کی اور آج کی جدید اردو کہہ سکتے ہیں۔ آزادی سے آج تک ہندوستان کا اور شاید پاکستان اور کہیں کہیں بنگلہ دیش کا سب سے منحوس اور غیر انسانی حادثہ یہی ہے کہ انسان رہ رہ کر ایسا ہندو، مسلمان، سکھ اور عیسائی ہوجاتا ہے جو ہماری مشترکہ تہذیب پر اور عالمی امن پر ایک داغ ہے۔ یعنی فرقہ وارانہ فسادات۔ ناصر کاظمی، احمد فراز اور بشیر بدر وغیرہ جیسے محبتوں کے شاعر بھی اس دکھ کو اپنی تمام غزلیہ تہذیب کے ساتھ پیش کرکے غزل کی اس فرض شناسی کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ جب زندگی پر ایسا کوئی برا وقت پڑتا ہے تو غزل اپنی تمام رومانی خوبیوں کے باوجود زندگی کے حقائق سے بھی آنکھیں ملاتی ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ غزل جس کے معنی محبوب سے گفتگو یا محبوب کی گفتگو ہے وہ اتنا وسیع مفہوم رکھتی ہے جو تمام زندگی پر محیط ہو جاتی ہے۔

یہ وہ حالات ہیں جنھوں نے شاعر کے حسّاس دل کو بے قرار کر دیا۔ اپنے مشاہدات اور تجربات کو من وعن بیان کیا اور زندگی کے تمام مسائل غزل کے موضوع بنے اور غزل کے شعراء نے بڑے خلوص کے ساتھ اپنے عہد کے دکھ درد کو مل جل کر بانٹا،

زبان کی کیفیت بھی بدلی۔ سادگی کے ساتھ ہندی اور انگریزی الفاظ کا غزل میں شامل ہونا اس عہد کا خاصہ ہے۔

کھلے سے لان میں سب لوگ بیٹھیں چائے پئیں
دعا کرو کہ خدا ہم کو آدمی کر دے

(بشیر بدر۔ علی گڑھ میگزین، علی گڑھ)

مٹی جمی ہوئی تھی جب کوٹ کے کفوں پر
حیرت ہوئی تھی مجھکو لوگوں کے قہقہوں پر

(شہزاد احمد۔ رسالہ فنون، لاہور)

کل کے پھول کی پتی کب تک کالے کوٹ پہ ٹانکے پھریے
رنگ برنگ باغیچے میں پنکھڑیوں کی کون کمی ہے

(بمل کرشن اشک۔ تحریک دلّی)

وہ بالکونی میں آئے تو راستہ رُک جائے
سڑک پہ چلنے لگے تو ہمارے جیسا ہے

(بشیر بدر۔ کتاب، لکھنؤ)

چائے کی پیالی میں نیلی ٹیبلٹ گھولی
سہمے سہمے ہاتھوں نے اک کتاب پھر کھولی

(بشیر بدر۔ ۱۹۵٦ء، اکائی اشاعت ۱۹٦۹ء صفحہ ۴۱)

مندرجہ بالا مطلع بشیر بدر کی اس غزل کا ہے جس میں قریب قریب سارے شعروں میں انگریزی لفظوں کو لایا گیا تھا۔ اسی غزل کے تین اور شعر تحریر کئے جا رہے ہیں

- یہ غزل چھ شعروں پر مشتمل ہے جو ۱۹۵۶ء میں لکھی گئی تھی۔

دائرے اندھیروں کے روشنی کے پوروں نے
کوٹ کے بٹن کھولے ٹائی کی گرہ کھولی
اک کتاب، چاند اور پیڑ، سب کے کالے کالر پر
ذہن ٹیپ کی گردش منہ میں طوطوں کی بولی
وہ نہیں ملی ہم کو، ہک، بٹن، سرکتی جینس
زپ کے دانت کھلتے ہی آنکھ سے گری چولی

(اکائی۔ بشیر بدر صفحہ ۴۱)

کوئی پھول دھوپ کی پتیوں میں ہرے ربن سے بندھا ہوا
وہ غزل کا لہجہ نیا نیا نہ کہا ہوا نہ سنا ہوا

(بشیر بدر۔ کلچر یکساں)

وہ زعفرانی پلوور اسی کا حصہ ہے
کوئی جو دوسرا پہنے تو دوسرا ہی لگے

(بشیر بدر۔ رسالہ کتاب۔ لکھنؤ)

رومال پر تھے پھول کڑھے پات شال پر
دیکھا تھا میں نے کل اسے بک اسٹال پر

(ناصر شہزاد۔ سیپ)

ان اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُس وقت کے اِن نوجوان شاعروں نے جو غزل کی روح کو سمجھتے تھے اور خاص طور پر غزل کی کئی سو سالہ روایتوں کو جزوی طور پر قائم رکھتے ہوئے انہوں نے ہی ایسی اردو جس میں انگریزی کے الفاظ یا اور دوسری زبانوں

کے الفاظ روزمرّہ کی زندگی کا حصّہ بن چکے تھے انھیں غزل میں شامل کرنے کا حوصلہ کیا۔ ایسا نہیں ہے کہ ان لوگوں نے پرانی روایتوں کو اور پرانی زبان کو بالکل چھوڑ دیا ہو بلکہ انھیں لوگوں نے ایسے روایتی شعر بھی کہے ہیں جو اپنی پرانی خوبیاں بھی رکھتے ہیں اور آج بھی پسند کئے جاتے ہیں لیکن زمانے کا مزاج ایسا بدلہ کہ اسی زمانے کا ایسا شعر سمجھنے والا شاید کوئی نیا ذہن نہیں تھا اور صرف بزرگ لوگ ہی ان کے فارسی زدہ اشعار کی داد دے سکتے تھے۔ مثلاً

یہ عرض وسماں تنگ ہیں مانند کف دست
اک دشت با انداز چشم نگراں اور

(حمید نسیم۔ نیا دور کراچی۔ ۱۹۶۸ء)

اس شعر سے یہ اشارہ کیا گیا ہے کہ اس زمانے میں بھی ایسے پرانے رنگ کے شعر لکھے جاتے تھے، لیکن اسی زمانے میں وقت کے ساتھ تبدیلیاں پیدا ہوئیں اور زبان و بیان کی سادگی میں اپنے عہد اور اس کی پیچیدہ فکر کو اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ جس سے صاف اندازہ ہوتا ہے کہ دنیا کی طرز وفکر بدل رہی ہے۔

۱۹۶۰ء کے آس پاس ادبی رسالوں میں ہندوستان اور پاکستان کے جن شعراء کا کلام شائع ہوتا تھا ان میں جدید اردو غذل کے اہم نام ناصر کاظمی، احمد مشتاق، خلیل الرحمٰن اعظمی، شہریار، بشیر بدر وغیرہ کے ہیں۔ ان شعراء کے ساتھ ساتھ کچھ شعراء کے یہاں بھی ایک یا دو شعر ایسے مل جاتے ہیں جن کی لفظیات بنیادی طور پر عربی فارسی کی نہیں بلکہ آسان اردو کے علاوہ ہندی اور انگریزی بول چال کی زبان کا حصّہ تھیں۔ مثال کے طور پر چند شعر لکھے جا رہے ہیں:

میرے کوٹ کا میلا کالر اور نمایاں ہوتا ہے
بانکی سج دھج رکھنے والے تیرے سامنے بیٹھے کون

(احمد ظفر۔ پاکستان)

سیّد نہ ریڈیو نہ سنیما ہے آپ کا
اپنے ہی گیت گایئے اور رقص کیجئے

(مظفر علی سیّد۔ پاکستان)

شاخوں پہ پرندوں کی یہ بے تاب صدائیں
اس پیڑ تلے شام کا اخبار نہ سن لیں

(اعتبار ساجد۔فنون لاہور)

وہ کیا گیا کہ کمرے کا منظر ہی بجھ گیا
پھر میں نے اٹھ کے کھڑکی سے پردہ ہٹا دیا

(محسن شیخ۔فنون لاہور ۲۰۰۲ء)

کسے سناؤں میرے دکھ کا ماجرا، مرے دل !
کہ تیرے دکھ کی پڑی ہے کسی کو کیا مرے دل!!

(سلطان سکون۔فنون لاہور، ۲۰۰۲ء)

تجھ کو زخم دکھایا تھا
تو نے اور دکھایا دل

(رؤف امیر۔فنون لاہور)

بھاگ جاگے ہیں اگر خواب میں سوتے رہنا
جاگ اٹھنے پہ نظارہ بھی بدل سکتا ہے

(رؤف امیر۔فنون لاہور)

کون اُٹھ کر دیکھتا آنگن میں پھیلی چاندنی
ہم دسمبر کی شب یخ بستہ کے مہتاب تھے

(محمد فیروز شاہ۔فنون لاہور)

محمد فیروز شاہ نے اپنے شعر میں لفظ دسمبر کا استعمال کیا ہے لیکن اس میں فارسی کے لفظوں کو شامل کر کے جدید اور قدیم کا امتزاج کر دیا ہے۔ پاکستان میں یہ حسن مانا جائے گا، لیکن ہندوستان میں جدید شعراء ہندی اور انگریزی کے الفاظ کا زیادہ استعمال کر رہے ہیں۔

پاکستان کے ہارون رشید نے بہت خوب صورتی سے ''پاؤں پسارنا'' اپنے شعر میں استعمال کیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

ابھی پاؤں پسارے تھے زمیں پر
کہ اٹھنے کا اشارہ کر گیا ہے

(ہارون الرشید۔فنون لاہور)

مجھے فٹ پاتھ جنّت لگ رہے ہیں
کہ ان سے ماں کی خوشبو آ رہی ہے

(ارشد جاوید۔فنون لاہور)

خالد خواجہ کا یہ شعر جدید شاعری کی مثال ہے۔

ہم ٹوٹ کے کرتے ہیں میری جان محبت
یہ کام کبھی حسب ضرورت نہیں کرتے

(خالد خواجہ۔ پاکستان)

شاعرات کے یہاں موضوعات اور لفظیات عام طور پر منفی اور محدود ہیں جبکہ شعراء حضرات کے یہاں نئے نئے لفظیات کیساتھ تقریباً ہر موضوع پر شعر مل جاتے ہیں چاہے وہ عشق، سیاست، فساد، خوشبو، اداسی، وصال، دھوپ، سایہ، ماں، مہر، طلاق وغیرہ کوئی بھی موضوع ہو۔ ان موضوعات پر چند اشعار شاعرات اور شعراء حضرات کے بطور نمونہ پیش ہیں۔

جہاں میں کس کو میسر ہوئی ہے فکر کی دھوپ
ہر ایک کوئی شجر سایہ دار مانگے ہے

(آل احمد سرور، آزادی کے بعد اردو غزل
اردو ادب صفحہ ۱۳۵)

تو خدا ہے نہ میرا عشق فرشتوں جیسا
دونوں انساں ہیں تو کیوں اتنے حجابوں میں ملیں

(احمد فراز)

سیاست کی اپنی الگ اک زباں ہے
لکھا ہو جو اقرار انکار پڑھنا

(بشیر بدر)

لوگ ٹوٹ جاتے ہیں ایک گھر بنانے میں
تم ترس نہیں کھاتے بستیاں جلانے میں

(بشیر بدر)

دیکھا انھیں قریب سے ہم نے تو رو دیے
جن بستیوں کو آگ لگانے چلے تھے ہم

(خورشید الاسلام۔ ۱۹۵۷ء رسالہ اگ جاں)

اُداسی کا یہ پتھر آنسوؤں سے نم نہیں ہوتا
ہزاروں جگنوؤں سے بھی اندھیرا کم نہیں ہوتا

(بشیر بدر)

تم پاس نہیں ہو تو عجب حال ہے دل کا
یوں جیسے میں کچھ رکھ کے کہیں بھول گئی ہوں

(ادا جعفری)

دیکھ کر جس شخص کو ہنسنا بہت
سر کو اس کے سامنے ڈھکنا بہت

(کشور ناہید)

شب وصال کے بعد آئینہ تو دیکھ اے دوست
تیرے جمال کی دوشیزگی نکھر آئی

(فراق گورکھپوری)

یہ دھوپ تو ہر رُخ سے پریشان کرے گی
کیوں ڈھونڈ رہے ہو کسی دیوار کا سایہ

(اطہر نفیس۔فنون ۱۹۶۹ء)

وہ لمحہ جب میرے بچے نے ماں پکارا مجھے
میں ایک شاخ سے کتنا گھنا درخت ہوئی

(حمیرا رحمٰن)

مجھ پہ چھا جائے وہ برسات کی خوشبو کی طرح
انگ انگ اپنا اسی رُت میں مہکتا دیکھوں

(پروین شاکر)

میری الماریوں میں قیمتی سامان کافی تھا
مگر اچھا لگا اس سے نئی فرمائشیں کرنا

(حمیرا رحمٰن)

طلاق دے تو رہے ہو غرور و قہر کے ساتھ
میرا شباب بھی لوٹا دو میرے مہر کے ساتھ

(پروین شاکر)

جدید غزل گو شعراء میں جو نام خصوصی اہمیت کے حامل ہیں ان میں ناصر کاظمی، ابن انشاء، خلیل الرحمٰن اعظمی، شاد عارفی، منیر نیازی، احمد فراز، بشیر بدر، ظفر اقبال، ندا فاضلی، محمد علی تاج، اختر نظمی، ادا جعفری، فضل تابش، کشور ناہید، پروین شاکر، حمیرا رحمٰن، کیف بھوپالی، اور سیلانے سیوتے وغیرہ اِن شعراء نے غزل کے پرانے موضوعات

کو نئی زندگی سے ہم آہنگ کر دیا۔ اس لئے غزل کی لفظیات میں بڑی تبدیلی ہوئی ہے۔ پرانے استعارے کم ہو گئے اور نئے لفظوں سے نئی امیجری بنی ہے جو پرانے سے بھی ہم آہنگ ہے خاص طور سے ہندوستان اور پاکستان کے مقبول اور اہم شعراء میں احمد فراز، بشیر بدر، پروین شاکر اور ندا فاضلی وغیرہ کا کلام ہندی گجراتی، مراٹھی، پنجابی اور سندھی رسم الخط میں چھپنے لگا ہے۔ ان شعراء کے علاوہ کئی شعراء کا کلام ہندی اردو میں تو عام طور پر مل ہی جاتا ہے۔

جدید اردو غزل کے شعراء کے کلام کو مختلف زبانوں کے قاری تو پڑھنا چاہتے ہی ہیں اس کے علاوہ خود شعراء حضرات ادب کے میدان میں سائنسی علوم کی آہٹیں محسوس کر رہے ہیں اور ہر جگہ پرانی چیزوں میں نیا پن تلاش کرنے کی اور ہر جگہ ایک نیا تجربہ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

ہر طرف کار ریل اور بسیں
اب سمندر میں گھر بناؤں کیا؟

(بشیر بدر)

کلپنا کھو گئی ہے تاروں میں
اپنی بچّی کو ڈھونڈ لاؤں کیا؟

(بشیر بدر)

(کلپنا چاؤلا جو اسپیس شٹل سے اسپیس میں گئی اور واپس نہیں آسکی)

اداس چاند ستاروں کو ہم نے چھوڑ دیا
ہوا کے ساتھ چلے اور ہوا کو موڑ دیا

(بشیر بدر)

ان مناظر میں بڑی جان سی پڑ جائے گی
سبز تاروں کو کرو چاند کو نیلا کردو

(پرکاش فکری)

میں اٹھا کر غزل بنادوں گا
شبد جتنے گرے پڑے ہوں گے

(بشیر بدر)

آج سنڈے ہے کل بھی چھٹی ہے
آسمانوں میں گھوم آؤں کیا

(بشیر بدر)

اس شعر کی اصل روح یہ ہے کہ آدمی پلک جھپکتے ہی وہاں بذات خود پہنچ سکتا ہے جہاں پہلے انسان کا صرف تصور اور خواب پہنچتا تھا۔ بشیر بدر کا یہ شعر:

سر پر زمین لے کے ہواؤں کے ساتھ جا
آہستہ چلنے والوں کی باری نہ آئے گی

آج کے سائنٹفک دنیا اور تیز رفتار زندگی اور ترقی کرنے والوں کو نصیحت بھی ہے اور حوصلہ بھی بڑھاتا ہے۔

دراصل بول چال اور دل کی زبان اپنے عہد کی بولی جانے والی زبان ہوتی ہے جس میں ساری دنیا میں اردو غزل لکھنے والے شاعر اور شاعرات غزل لکھ رہے ہیں اور آسان لفظیات کے ساتھ نئے نئے موضوعات اپنی شاعری میں لا رہے ہیں۔ مثلاً:
پروین شاکر کہتی ہیں:

وہ جہاں بھی گیا لوٹا تو میرے پاس آیا
بس یہی بات تھی اچھی میرے ہرجائی کی

☆

کمال ضبط کو خود بھی تو آزماؤں گی
میں اپنے ہاتھوں سے اس کی دلہن سجاؤں گی

☆

جگنو کو دن کے وقت پرکھنے کی ضد کریں
بچے ہمارے عہد کے چالاک ہوگئے

ابن انشاء کا مشہور شعر ہے:

کل چودھویں کی رات تھی شب بھر رہا چرچا ترا
کچھ نے کہا یہ چاند ہے کچھ نے کہا چہرہ ترا

خلیل الرحمٰن اعظمی فرماتے ہیں:

رات تو خیر کسی طرح سے کٹ جائے گی
رات کے بعد کئی کوس کڑے اور بھی ہیں

☆

سونا لینے جب نکلے تو ہر ہر ڈھیر میں مٹی تھی
جب مٹی کی کھوج میں نکلے سونا ہی سونا دیکھا

ظفر اقبال کا کہنا ہے:

میں بکھر جاؤں گا زنجیر کی کڑیوں کی طرح
اور رہ جائے گی اس دشت میں جھنکار میری

☆

نہ اتنی تیز چلے سرپھری ہوا سے کہو

شجر پہ ایک ہی پتا دکھائی دیتا ہے

بشیر بدر کے اشعار ملاحظہ ہوں:

سات صندوقوں میں بھر کر دفن کردو نفرتیں

آج انساں کو محبت کی ضرورت ہے بہت

☆

میں تمام تارے اٹھا اٹھا کے غریب لوگوں میں بانٹ دوں

کبھی ایک رات وہ آسماں کا نظام دے میرے ہاتھ میں

☆

ہندو بنو تو متھرا، مسلم بنو تو مکہ

انساں اگر رہو تو سارا جہاں تمہارا

☆

جس دن سے چلا ہوں میری منزل پہ نظر ہے

آنکھوں نے کبھی میل کا پتھر نہیں دیکھا

☆

یہ پھول مجھے کوئی وراثت میں ملیں ہیں

تم نے مرا کانٹوں بھرا بستر نہیں دیکھا

احمد فراز کے مشہور شعر ہیں:

سنا ہے بات کرے وہ تو پھول جھڑتے ہیں
یہ بات ہے تو چلو بات کرکے دیکھتے ہیں

☆

کس کس کو بتائیں گے جدائی کا سبب ہم
تو مجھ سے خفا ہے تو زمانے کے لئے آ

☆

اب کے ہم بچھڑے تو شاید کبھی خوابوں میں ملیں
جس طرح سوکھے ہوئے پھول کتابوں میں ملیں

مظہر امام فرماتے ہیں:

اپنا ہی فیصلہ تھا گھر چھوڑ کر چلیں
مُڑ مُڑ کے پھر یہ کیوں در و دیوار دیکھنا

مظفر حنفی کے اشعار:

گھٹا کا کیا ہے برس کر نکل گئی آگے
یہاں سسکتے رہے رات بھر در و دیوار

☆

اگر کردار بکنے کے لئے ہے
تو بہتر ہے کہ بے کردار ہوجا

شہریار فرماتے ہیں:

شدید پیاس تھی پھر بھی چھوا نہ پانی کو
میں دیکھتا رہا دریا تری روانی کو

ندا فاضلی:

گھر سے مسجد ہے بہت دور چلو یوں کرلیں
کسی روتے ہوئے بچے کو ہنسایا جائے

☆

نقشہ اٹھا کے اور کوئی شہر دیکھئے
اس شہر میں تو سب سے ملاقات ہوگئی

ناصر کاظمی:

جنگل میں ہوئی ہے شام ہم کو
بستی سے چلے تھے منہ اندھیرے

☆

ہمارے گھر کی دیواروں پہ ناصر
اداسی بال کھولے سو رہی ہے

# جدید اردو غزل کے اثرات ہندی غزل پر

جدید اردو غزل کے اثرات ہندی غزل میں واضح طور پر نظر آتے ہیں کیونکہ اردو اور ہندی کے افعال ایک ہیں۔ گھر اور بازار کی بہت سی چیزوں کے نام ایک ہیں۔ عام انسان کی بولی ایک ہے۔ ہندی کے شاعروں نے عربی فارسی کے الفاظ کو اپنی غزل میں اس طرح سمولیا کہ وہ ہندی بن گئے اور ان الفاظ کو غزل میں استعمال کر کے اس غزل کے شعر کو ہندی غزل کا شعر کہا۔ مثلاً گوپال داس نیرؔج کا یہ شعر جس میں خوشبو اور زعفران کو ہندی غزل میں استعمال کیا ہے۔

خوشبو سی آرہی ہے ادھر زعفران کی
کھڑکی کھلی ہے پھر کوئی ان کے مکان کی

(نیرؔج)

رام پرکاش گوئل ہندی کے کوی ہیں اور کس اپنائیت سے قسمت، ویران اور مسافر (فارسی کے الفاظ) کو اپنے شعر میں باندھا ہے:

قسمت میں لکھا جس کی ہو ویران بھٹکنا
جنگل کے مسافر نے کبھی گھر نہیں دیکھا

شاعری کی تاریخ دیکھی جائے تو عربی زبان میں شاعری زمانۂ جاہلیت سے ملتی ہے۔ اس وقت شاعر قصیدے لکھتے تھے اور اسے بچہ بچہ یاد کرتا تھا۔ شاعر اپنا کلام لکھ

کر خانۂ کعبہ پر لٹکا دیتے تھے۔ غزل امیر خسرو کے زمانے سے اردو میں آئی اور مقبول ہوتی چلی گئی۔ میؔر سے لے کر فراقؔ گورکھپوری تک غزل کے زندہ رہنے والے شعر شعوری یا لاشعوری طور پر اس زبان میں ہوئے جو تعلیم یافتہ لوگوں کی اردو اور ہندی زبان تھی۔

آزادی کے بعد ایک عرصے تک اردو ہندوستان میں بے توجہی کا شکار رہی لیکن آج پھر یہ زبان لہجہ کی شیرینی، شائستگی اور سادگی کے سبب ہر دل عزیز ہوتی جا رہی ہے۔ خاص طور پر صنفِ غزل جو اردو شاعری کی آبرو ہے ہندی میں بے حد مقبول ہے۔ اس کا سبب اس کے موضوعات کی ہمہ گیری، طرز بیان کی دلاویزی اور اختصار ہے۔ ہندی میں ایسے لاتعداد شعراء ہیں جو اردو رسم الخط سے ناواقفیت کے باوجود غزل لکھ رہے ہیں۔ مشاعرے، کوی سمیلن، ریڈیو اور ٹی.وی. نے اس سلسلے میں اہم رول ادا کیا ہے جس کے ذریعہ غزل کے مزاج، طرز بیان اور ادائیگی الفاظ سے واقفیت عام ہے۔ اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ عام طور پر اردو شعراء بھی عام فہم زبان میں ہی غزل لکھ رہے ہیں۔ ایسا کرنا ناگزیر بھی ہے کیوں کہ نشر و اشاعت کے وسیع ہو جانے کی وجہ سے ہر خاص و عام ان کا سامع اور قاری بن گیا ہے۔

اگر ہم بغور مطالعہ کریں تو پتہ چلے گا کہ بول چال کی زبان زندگی کی زبان ہوتی ہے۔ ہندوستانی عوام کسی بھی زمانے میں انگریزی سے محبت نہیں کرتے تھے لیکن غدر کے زمانے میں آہستہ آہستہ انگریزی زبان کا اثر ہندی اور اردو زبان پر پڑا اور انگریزوں کے چلے جانے کے بعد فضاء اتنی صاف ہوگئی کہ اب جو ہندی اردو آئی اس میں کھڑی بولی بنیادی طور پر جسم اور جان تھی لیکن عربی، فارسی، ہندی، اردو اور اسی طرح انگریزی کے کچھ الفاظ (جیسے ربن، آفس، اسکول، کلکٹر وغیرہ) بھی عام زبان میں شامل ہو گئے۔

اگر ہم بغور مطالعہ کریں تو ابتدائی دور کی ہماری وہ اردو غزل جس میں اردو میں عربی فارسی کے عالمانہ الفاظ شامل تھے آج اسکولوں، کالجوں اور دفتروں میں جانے کے بعد غزل اس زمانے کی خالص ادبی زبان کو چھوڑ کر آج بھی سارے عربی اور فارسی کے لفظ اپنا چکی ہے۔

ہندی غزل بہت بعد میں شروع ہوئی ورنہ ہر ہندو اور مسلمان شاعر جس رسم الخط میں شعر لکھتا تھا اس کا وفادار ہوتا تھا۔ مثلاً رگھوپتی سہائے فراقؔ اردو کے شاعر تھے لیکن آج ہندی کا شاعر جو اپنا نام تک اردو رسم الخط میں نہیں لکھ سکتا وہ جب کوئی فعل لائے گا تو وہی ہوگا جو اردو شاعری کے فعل ہیں اور ہندی شاعری کا دعویٰ یہ ہے کہ یہ ہندی ہے اور اردو رسم الخط میں لکھنے والے شاعر کا دعویٰ کہ یہ اردو ہے۔ یہ افعال جو اردو ہندی کے مشترک ہیں وہ سنسکرت کی بدلتی ہوئی شکلوں میں سے آخری شکل کھڑی بولی ہیں اس لئے ہندی اور اردو غزل میں بنیادی فاصلہ کچھ نہیں ہوا۔ فارسی اور عربی سے لے کر انگریزی زبان تک جو اسم ہم اردو اور ہندی میں لائیں گے وہ سب جس رسم الخط میں لکھ دئے جائیں گے اسی کے ہو جائیں گے۔ مثلاً ایک آدمی یہ کہے کہ میری بک واپس کردو اور دوسرا کہے کہ کتاب میری ہے اور تیسرا کہے کہ یہ پستک تو میں لایا تھا۔ یہ جملے جس رسم الخط میں لکھ دیئے جائیں گے اس زبان کے جملے مان لئے جائیں گے۔

ہمارے زمانے تک پہنچتے پہنچتے اردو کی غزل سو فیصد اردو کی غزل رہی بلکہ اور زیادہ خوبصورت اور طاقتور ہوگئی کہ اردو نے فارسی اور عربی کے ساتھ بہت سے انگریزی کے الفاظ کو خوب صورتی سے چھین کر اپنی زبان میں اس طرح ملالیا کہ وہ اردو ہوگئے۔ یہ طریقہ کار ہندی کے کویوں نے بھی اپنایا اور ہندی کے کوی ہندی رسم الخط میں تقریباً اسی

انداز میں فارسی، عربی اور انگریزی الفاظ کے ساتھ شاعری کرنے لگے۔

اس سلسلے میں چند ہندی کے کویوں (شاعروں) کا کلام پیش خدمت ہے۔

### اوم پر کاش مشرا کنچن :-

ان کی غزلوں کے مجموعے کا نام ''مایوس نہ ہو دل'' ہے۔ ۱۹۳۶ء میں پیدا ہوئے۔ کانپور میں کالج کے پرنسپل کے عہدے سے رٹائر ہوئے۔ کنچن کی شاعری میں فارسی الفاظ کا استعمال بہت خوبی کے ساتھ کیا گیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

جو تاج سے جڑا وہ کوہ نور ہوگیا
باغی جو ہوگیا وہ نگینہ غلام ہے

صدیوں نچایا اپنے اشاروں پہ مرد نے
لیکن نہیں وہ آج ذہینہ غلام ہے

☆

آندھی اُٹھی اُدھر ہے بڑی زور سے اِدھر
ہیں ایک دوسرے سے سفینے کٹے ہوئے

☆

مندر بھی رہے مسجد بھی رہے دونوں میں سے ٹوٹے نہ کوئی
گنگا بھی بہے کاویری بھی دونوں میں سے سوکھے نہ کوئی

### الڑھ بیکانیری :-

الڑھ بیکانیری کی غزل کا مجموعہ ''ٹھاٹھ غزل کے'' کے نام سے شائع ہوا۔ ویسے وہ طنز و مزاح کے کوی ہیں۔ ان کو کئی انعامات بھی ملے جس میں ''کاکا ہاتھ رسی

پرسکار" اہم ہے۔ ان کی غزل کے اشعار سادہ زبان کے ساتھ معنی کی گہرائی لئے ہوئے ہیں۔ مثلاً:

جو پتھر خود تراشا ہو ندی نے
وہ پتھر بھول جاتا ہے ندی کو

☆

فنا کی گود میں پھولا پھلا ہوں
تلاطم ہوں، بھنور ہوں زلزلہ ہوں

## گوپال داس نیرجؔ :-

گوپال داس نیرجؔ کا ہندی ساہتیہ میں بڑا نام ہے۔ انہوں نے بھی ہندی کے تقریباً ہر صنف میں اپنا کمال دیکھایا ہے۔ ہندی میں ایم.اے. کیا۔ ان کا کلام کئی پردیشوں میں نصاب میں شامل ہے۔ نیرج کی غزل اور گیت کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ان کا کوی سمیلنوں میں اپنا کلام سنانے کا انداز یکتا تھا جو ان کی پہچان بن گیا تھا۔ نیرج نے فلموں کے لئے بھی کئی گیت لکھے جس میں ان کا یہ گیت مقبول خاص و عام ہوا۔

کارواں گزر گیا غبار دیکھتے رہے

ان کے اس شعر میں جو ذیل میں لکھا جائے گا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ فلمی شاعری کرنے سے خوشی اور اطمینان محسوس نہیں کر پاتے تھے۔

چند گیتوں کی زندگی کے لئے
زندگی کو تباہ کرنا پڑا

ان کی غزلوں میں قدیم اور جدید آہنگ کے ساتھ میرؔ و غالبؔ کا اثر نمایاں نظر آتا ہے:

خوشبو سی آرہی ہے اِدھر زعفران کی
کھڑکی کھلی ہے پھر کوئی ان کے مکان کی

ہارے ہوئے پرند ذرا اُڑ کے دیکھ تو
آجائے گی زمین پہ چھت آسمان کی

بجھ جائے سرِ شام ہی جیسے کوئی چراغ
کچھ یوں ہے شروعات میری داستان کی

نیرجؔ کو کئی اعزازات اور انعامات سے بھی نوازا گیا جو قابل ذکر ہیں۔ اتر پردیش سے ''یش بھارتی'' ایوارڈ، پدم شری بھارت سرکار سے اور فلم فیئر ایوارڈ کے ساتھ کئی اداروں نے ان کو عزت بخشی۔

موجودہ زمانے کی ترقی کے ساتھ سائنس کی ایجادات سے بھی وہ غافل نہیں ہیں۔ان کے اس شعر کو دیکھئے جو انسانیت کی فکر کا اظہار کر رہا ہے:

چاند کو چھو کے چلے آئے ہیں وگیان کے پنکھ
دیکھنا یہ ہے کہ انسان کہاں تک پہنچے

نیرج کے کچھ مقبول اشعار:

ہم تری چاہ میں اے یار! وہاں تک پہنچے
ہوش یہ بھی نہ جہاں ہے کہ کہاں تک پہنچے

☆

تمام عمر میں اک اجنبی کے گھر میں رہا
سفر نہ کرتے ہوئے بھی کسی سفر میں رہا

☆

زندگی سے نباہ کرنا پڑا
اس لئے ہی گناہ کرنا پڑا
وقت ایسا بھی ہم پہ گزرا جب
آہ بھر بھر کے واہ کرنا پڑا

☆

اس کو کیا خاک شرابوں میں مزا آئے گا
جس نے اک بار بھی وہ شوخ نظر دیکھی ہے

## وجے واطے :-

وجے واطے ہندی غزل کے ایک اہم شاعر ہیں۔ اردو ہندی کو ایک کرنے میں کافی عرصے سے لگے ہوئے ہیں اور ان کو اس میں کامیابی بھی ملی ہے۔ وجے واطے دس جون ۱۹۵۰ء کو امراوتی (مہاراشٹر) میں پیدا ہوئے۔ شاعری کا شوق انہیں طالب علمی کے زمانے سے تھا۔ ان کے دو مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ ''غزل'' اور ''دو مصرعے''۔

وجے واطے کی کتاب ''غزل'' میں بشیر بدر کا مضمون ''وجے واطے کی غزلیں'' کے عنوان سے ہے جس میں وہ لکھتے ہیں:

''وجے واطے غزل کے ایک نئے لیکن اچھے شاعر ہیں۔ ان کی نظر آج کی زندگی کے بہت سے پہلوؤں پر ہے۔ وہ اپنی غزل

میں سچی زندگی جیتے ہیں، اس لئے ان کی غزل میں محبت کی
یادوں کے چراغ روشن ہیں، پیار کے خواب ہیں، زندگی کی
دھوپ ہے، شہروں اور سڑکوں کی دوڑ بھاگ ہے، گاؤں کی کچی
پکی پگ ڈنڈیاں ہیں۔''

دنیا کا سب سے بڑا المیہ ہے فرقہ پرستی۔ اس پر وجے واطے کا یہ شعر دل کو
چھولیتا ہے:

ایک تقریر صرف کافی ہے
کیا ضرورت دیا سلائی کی

وجے واطے نے غزل کی روح کو چھوتے ہوئے شعر کہا ہے وہ یہ ہے:

کہنے والے دو مصرعوں میں سارا قصہ کہتے ہیں
ناچ نہیں آتا جنکو وہ آنگن ٹیڑھ کہتے ہیں

وجے واطے کی غزل میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ سہل اور صاف
زبان میں لکھتے ہیں اور ہر موضوع پر ان کے اشعار اپنے بلند معیار کے ساتھ موجود ہیں۔
اشارے اور کنایہ میں بہت بڑی بات کہہ دیتے ہیں:

ایک پل میں جی لئے پورے برس پچیس ہم
آج بٹیا جب دکھی ساڑی تیری پہنی ہوئی

☆

جیسے جیسے ہم بڑے ہوتے گئے
جھوٹ کہنے میں کھرے ہوتے گئے

☆

آج سے کٹی ہماری فون مت کنا ہمیں

دیکھ لی یاری تمہاری فون مت کرنا ہمیں

☆

سب کی خوش فہمیاں بڑھاتا ہے

آئینہ سچ تو بولتا ہی نہیں

وجے واطے کی شاعری میں نئی امیجری اور انگریزی کے الفاظ بھی گاہے گاہے مل جاتے ہیں۔

یوں ذرا سا چمک کے بجھ جانا

دن ہے، جگنو کا کھیل ہے، کیا ہے

کوئی دروازہ کھولتا ہی نہیں

اپنی دنیا ہے ریل ہے کیا ہے

وجے واطے کو کئی انعامات اور اعزازات سے بھی نوازا گیا۔ ''ڈائریکٹر جنرل آف پولس'' کے عہدے پر فائز ہیں۔ ان کو ۱۹۹۵ء میں ''بھارتیہ پولس پدک'' ملا اور ۲۰۰۳ء میں پولس کی اعلیٰ خدمات کے لئے ''راشٹر پتی کا پولس پدک'' ملا۔ ان کی ملازمت کا اثر شاعری میں اس طرح نظر آتا ہے۔

یہ تماشہ ہے کھیل ہے کیا ہے

زندگی ہے کہ جیل ہے کیا ہے

وجے واطے کے اس شعر میں جو اشاریت ہے وہ بہت گہری ہے۔ غزل کے اس انداز کی

پردہ داری میں دنیا کے سرد و گرم کو بہت خوبی سے پیش کیا ہے۔

آج سن لو زندگی کی وہ خبر
جو کسی اخبار میں آئی نہیں

درج ذیل اشعار وجے واطلے کے معنی خیز اسلوب کے کامیاب نمونے ہیں:

کیا کروں کیا کیا کروں، کیسے کروں تیرا بیاں
تو تو بس احساس ہے اندر کہیں اترا ہوا

☆

چھڑیے ذکر اس زمانے کے
وہ فسانے ہیں دل دکھانے کے
ایک کوشش ہے بھول جانے کی
سو وجوہات یاد آنے کے

☆

سانپ سیڑھی کا یہ کھیل بھی خوب ہے
وہ جو نوے پہ تھے پھر صفر ہو گئے

بلا شبہ وجے واطلے ہندی غزل کے قابل ذکر شاعر ہیں اور اردو زبان اور غزل سے پوری طرح واقف اور متاثر ہیں۔

## شیر جنگ گرگ:-

شیر جنگ گرگ دہرادون میں پیدا ہوئے۔ ہندی میں ایم.اے. اور پھر پی.ایچ.ڈی. کیا۔ ان کا غزل کا مجموعہ ''کیا ہو گیا کبیروں کو'' کے نام سے شائع ہوا۔ ان

کے چند مشہور شعر ہیں:

مت پوچھئے کیوں پاؤں میں رفتار نہیں ہے
یہ کاروان منزل کا طلبگار نہیں ہے

☆

جو زندگی کے حق کو ناحق بنا رہے ہیں
ان کے مقابلے میں کوئی کھڑا تو ہوگا

☆

ڈھل گئی شوخ اشتہاروں میں
وقت کی سادگی رفتہ رفتہ

☆

اِک ضرورت ہے، مری قوم کا زندہ رہنا
موت کے خفیہ پنجوں سے نکلنا ہوگا

**بھگوان داس جین:-**

بھگوان داس جین ۱۹۳۸ء کو احمد آباد میں پیدا ہوئے۔ ان کا مجموعہ ''زندہ ہے آئینہ'' غزل کا مقبول مجموعہ ہے۔ ان کا کلام پڑھ کر یہ معلوم ہوتا ہے جیسے ہندی کے کوی کا نہیں اردو کے شاعر کا کلام ہو۔ جدیدیت کے ساتھ فارسی کے الفاظ کا استعمال بے شمار شعروں میں ملتا ہے۔ چند اشعار پیش ہیں۔

ستارا بجھ گیا جوں ہی دل ناکام تک پہنچا
مقدر یوں ہمارا گردشِ ایام تک پہنچا

اگر شوقِ سخن ہے تو کھلے دل کے دریچے رکھ
نظر کو میر و غالب سے عمر خیام تک پہنچا
اسی کی شاعری میں رنگ و فن چمکے گا جو شاعر
دیوانِ خاص ٹھکرا کر دیوانِ عام تک پہنچا

☆

عیبوں کو دیکھنے میں ہی گزری ہو جسکی عمر
کیسے اسے بھلا کوئی اچھا دکھائی دے
اپنی غزل سی زیست کے اس موڑ پر ہوں میں
مطلع کو دیکھتا ہوں تو مقطع دکھائی دے

☆

زندگی کا دوست سودا کیجئے کس سے یہاں
اوڑھ کر بیٹھے شرافت راہزن بازار میں
گھر سے نکلے تھے خریدیں گے کوئی شاہی لباس
بیچ آئے ہم خود اپنا پیرہن بازار میں

**اُرمل ستیا بھوشنڑ:-**

''اُرمل'' پنجاب کی شاعرہ ہیں۔ انہوں نے ہندی لٹریچر میں ایم.اے.کیا۔ ۱۹۴۰ء میں دینا نگر پنجاب میں پیدا ہوئیں۔ ان کی کئی غزلیں ایسی ملتی ہیں جو انہوں نے اردو کے اہم شاعروں سے متاثر ہو کر لکھی ہیں۔ آہنگ وہی ہے لیکن لہجہ کی انفرادیت پیدا نہیں کر سکیں اور افکار میں بھی کوئی ندرت نہیں ہے۔ ان کی غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

تم اونچے محل میں بھی بہت خوش نہیں دکھتے
تم نے کبھی ہم مستوں کا وہ گھر نہیں دیکھا
ساحل پہ کھڑے دور سے موجوں کو گنا ہے
تم نے کبھی امڑا ہوا ساگر نہیں دیکھا
مالی نے بغیچے میں کئی پھول کھلائے
پر پیاس سے مرتا ہوا تروور نہیں دیکھا

☆

ہاتھوں میں یوں تو عمر کا پیالہ بقا کا تھا
گھیرے ہوئے تھا جو اسے، سایہ قضاء کا تھا
اس موڑ پر جدھر سے گزرنا تھا جھوم کر
منظر تو دلفریب تھے خطرہ بلا کا تھا

☆

میں جہاں میں شبد پھولوں کو رہوں گی بانٹتی
ایک خوشبو کی طرح ہر دل کو میں مہکاؤں گی

## اُوشا یادو اوشاؔ:-

اُوشا یادو اُوشاؔ نے ہندی میں ایم.اے. کیا۔ ان کو شاعری کرنے کا شوق بچپن سے تھا۔ ۱۹۶۹ء میں الٰہ آباد میں پیدا ہوئیں۔ ان کے دو مجموعے ''امرائیاں'' اور ''سوز نہاں'' شائع ہو چکے ہیں۔

اوشا نے اردو غزل کا مطالعہ کیا ہے اس کا اندازہ ان کے اشعار سے ہوتا

ہے۔ غزل کی قدیم اور جدید زبان کے امتزاج سے غزل کا آغاز کیا ہے۔ ان کی زبان آگے چل کر اور عصری ہو جائے گی جس میں نئے خیالات اور نئے نئے تجربات ہونگے۔

ہر رات پہ طاری ہے ظلمات کدھر جائیں
اب بس میں نہیں اپنے حالات کدھر جائیں
جذبات کی دنیا نے قیمت ہی نہیں سمجھی
ہر سمت ملا دھوکا جذبات کدھر جائیں

☆

گیت مانوتا کے لکھو اور غزلیں پیار کی
سنگ دل افراد پر بھی ایک دن ہوگا اثر
عمر بھر لپٹی رہی بدبختیا مجھ سے اوشا
پھر بھی میں نے داغ نہ لگنے دیا کردار پر

## کیرتی کالے :-

کیرتی کالے ۱۹۶۸ء میں گوالیار مدھیہ پردیش میں پیدا ہوئیں۔ بی.ایس.سی. کرنے کے بعد انہوں نے ہندی میں ایم.اے. اور پی.ایچ.ڈی. کیا۔ ان کا کلام رسالوں میں اور اخباروں میں شائع ہوتا رہتا ہے۔ ان کے اچھے کلام کے اعزاز میں ان کو ''گوالیار جونیر چیمبر'' کے ذریعہ ''گوالیار رتن'' سے نوازا گیا۔ کیرتی کی غزلوں میں نسائیت ہے۔ جدید اردو غزل میں کئی شاعرات نے نسائیت سے بھرپور غزلیں لکھی ہیں جو جدید غزل میں اضافہ ہیں۔ کیرتی کالے بھی اس اضافے کو آگے بڑھانے میں شامل ہیں، لکھتی ہیں:

جانے کیوں میں پریشان تھی اپنی حالت پہ حیران تھی
تیری جادو بھری اک نظر میری شکل کا حل ہوگئی

☆

نہ تو رستے کی خبر ہے نہ ہی منزل کا پتہ
ایک انجانا سفر ہے لڑکیوں کی زندگی
ہے بڑا بیتاب پڑھنے کو جسے سارا جہاں
آج کی تازہ خبر ہے لڑکیوں کی زندگی
چاہے ہو اگنی پرکشا یا ہو چوسر کی بساط
ہر صدی میں داؤ پر ہے لڑکیوں کی زندگی

کیرتی کالے ہندی، اردو اور فارسی کے الفاظ کو غزل میں استعمال کرتی ہیں۔ ہندی کی تلمیحات کو بھی وہ آسانی سے شاعری میں لائی ہیں اور اپنے عہد کی تبدیلیوں کو بھی محسوس کر رہی ہیں۔ فارسی، ہندی اور اردو کے الفاظ جو آج کی غزل میں عام ہو چکے ہیں۔ اپنی اس کوشش کو کیرتی نے بڑے سلیقے سے برتا ہے۔

تھی ابھی تک کٹھن پرشن سی ایک روٹھے ہوئے جشن سی
تم ملے تو مجھے یوں لگا زندگی اب سرل ہوگئی

**رام داس مشر :-**

رام داس مشر ہندی کے بڑے کویوں میں سے ہیں جنھوں نے تقریباً ہر صنف سخن میں اپنا جوہر دکھایا۔ ان کی غزل گیت اور نظم کے تیرہ مجموعہ شائع ہوئے۔ انھوں نے ناول بھی لکھے، کہانیاں اور مضامین بھی کتابی شکل میں شائع کرائیں۔ اس کے علاوہ سفرنامے، آپ بیتی اور تنقید بھی لکھتے تھے۔

رام داس مشر ڈمری گورکھپور میں ۱۹۲۴ء میں پیدا ہوئے تھے۔ انہوں نے ہندی میں ایم.اے. اور پی.ایچ.ڈی. کیا۔ دہلی یونیورسٹی میں ہندی ڈپارٹمنٹ میں پروفیسر رہ کر وہیں سے اپنی تدریسی خدمات کو الوداع کہا۔ ان کو ''شلا کا سمان'' سے بھی نوازا گیا۔ ان کی غزل میں ہندی اور فارسی کے الفاظ کا خوبصورت امتزاج ملتا ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:

تم اکیلے یوں کھڑے آواز دیتے ہو کسے
ان گھنی آبادیوں کا من ہے ویرانہ ہوا
آگ کی لپٹوں سے پوچھو آدمی کے دل کا رنگ
درد کل تک تھا کہیں وہ آج افسانہ ہوا
پوچھتا پھرتا ہے دیکھو پھر محبت کا پتہ
پھر شرافت کے شہر میں کوئی دیوانہ ہوا

☆

کون سی ہے دھوپ اس مایا نگر میں دوستوں
ہم تو چھوٹے ہوگئے پرچھائیاں بڑھتی گئیں

☆

دیکھ لی دنیا تمھاری مہربانی دیکھ لی
تو نے دی تھی اے! خدا وہ زندگانی دیکھ لی
چیختی لپٹیں اچانک سامنے اُٹھنے لگیں
جب کسی گھر میں کوئی لڑکی سیانی دیکھ لی

## سوامی شیامانند سرسوتی روشنؔ :-

سوامی شیامانند سرسوتی روشنؔ بہت بڑے کوی اور شاعر ہیں۔ انھوں نے اپنی زندگی کو نیک کاموں کے لئے وقف کردیا۔ شاعری ان کو قدرتی طور پر ملی ہے اور خداداد صلاحیت ان میں یہ موجود ہے کہ نثر میں کہی گئی بات کو فوراً موزوں اشعار یا رباعی میں ڈھال لیتے ہیں۔ اپنا تعارف اس طرح پیش کرتے ہیں۔

शोधग्रंथ और इक-इक डिग्री गंगा जी को अर्पित कर दी,
जो कुछ भेंट मिली ईश्वर से ज्यों की त्यों कविता में धर दी

شودھ گرنتھ (تحقیقی مقالہ) اور اک اک ڈگری گنگا جی کو ارپت (دے دی) کر دی۔ جو کچھ بھینٹ (تحفہ) ملی ایشور سے جیوں کی تیوں کویتا (شاعری) میں دھر (لکھ) دی۔

سوامی روشنؔ جی کے اشعار بہت آسان زبان میں اور معانی کے لحاظ سے گہرائی لئے ہوئے ہوتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں۔

کیا جسم پہ اترانا، جو چھوڑ کے ہے جانا
اس پر بھی خبر کیا ہے، کب اور کہاں چھوڑو
کچھ ساتھ وہ لے جاؤ جو کام وہاں آئے
اور یاد کرے دنیا کچھ ایسا یہاں چھوڑو

☆

اپنی موج فقیری ہے
چھوتی پاؤں امیری ہے

من ہے تلسی جیسا تو

ہر اک بول کبیری ہے

موج اُڑاتے ہیں مجھ میں

کیا بچپن کیا پیری ہے

☆

تمھارا آنا جانا ہوگیا ہے

ضروری گھر سجانا ہو گیا ہے

بچھڑتی ہی نہیں یادیں تمہاری

تمھیں بچھڑے زمانہ ہو گیا ہے

ملے موتی ہمیں کیا آنسوؤں کے

ہمارا دل خزانہ ہوگیا ہے

☆

سنے گا وہ اگر دل سے کہوگے

اسے اک بار ہی کہنا بہت ہے

### دکشت دنکوری :-

دکشت دنکوری کا اصلی نام بھونیشور پرساد دکشت ہے۔ ان کی پیدائش ۱۹۵۶ء میں امروہا اتر پردیش میں ہوئی۔ ان کی غزلوں کا مجموعہ ''ڈوبتے وقت'' کے نام سے شائع ہوا۔ دکشت دنکوری نے ''غزل دشینت کے بعد'' کو بھی ترتیب دیا اور اس کے مدیر ہیں۔ دکشت دنکوری کی غزلوں میں نئے نئے تجربے اور خیالات کا اظہار ملتا ہے۔ فارسی ترکیبوں

کا استعمال بھی کم کیا گیا ہے لیکن پھر بھی بچ نہیں سکے۔ اُن کو ۲۰۰۱ء میں ''دشینت ایوارڈ'' سے بھی نوازا گیا۔ ہندی کے کویوں نے بھی جدید اردو شعراء کی طرح عام فہم زبان میں شاعری کرنے کی کوشش کی ہے جس میں وہ کافی حد تک کامیاب نظر آتے ہیں۔ ان کی غزل کے مختلف موضوع پر اشعار ملاحظہ ہوں۔

درد ظاہر کبھی نہیں کرتا
میں بھی ظالم کو یوں ستاتا ہوں
جانتا ہوں مزاج میں ان کا
اس لئے ہاں میں ہاں ملاتا ہوں
صبر کرتا ہوں لاکھ میں لیکن
باندھ کی طرح ٹوٹ جاتا ہوں

☆

کون گواہی دیگا اب
قتل سرِ بازار ہوا

☆

جس سے دب جائیں کراہیں گھر کی
کچھ نہ کچھ شور مچائے رکھئے

**چندر سین وراٹ :-**

چندر سین وراٹ ہندی غزل کے مشہور کوی ہیں۔ ان کے کئی غزلوں کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں جس میں ''نروا سنا چاندنی''، ''آس تھا کے امل تاش''، ''کچنار

کی ٹہنی'' وغیرہ مشہور ہیں۔ وراٹ مدھیہ پردیش کے اندور شہر میں ۱۹۳۶ء میں پیدا ہوئے ۔ ان کو مختلف اعزازات سے نوازا گیا۔ کتاب ''ہندی غزل، غزل کاروں کی نظر میں'' جس کے مدیر سردار مجاور ہیں انہوں نے کئی بڑے کویوں سے چند سوالوں کے جواب پوچھے۔ اس کتاب میں چندرسین وراٹ ہندی غزل کے بارے میں کہتے ہیں:-

''ہندی غزل آج کی سروادھک لکھی اور پڑھی جانے والی ودھا ہے، کویتا میں خاص کر گیتی کاویہ میں!
ایک اور اس میں بہت اچھا بھی لکھا جا رہا ہے تو دوسری اور باڑھ کے ساتھ کوڑھا۔ کرکٹ بھی بہہ کر آ رہا ہے۔''

(ہندی غزل۔ صفحہ ۳۳)

چندرسین وراٹ کے یہاں غزل میں ندرت ہے۔ فارسی کے الفاظ کا استعمال بہت خوبصورتی کے ساتھ کیا گیا ہے۔ چندرسین وراٹ کے ذہنی رویہ کا اظہار ان اشعار میں ہے۔

اس روپ کو باندھ سکوں ایسی کویتائی دے
آنکھوں کو ملے واڑی، واڑیں کو دکھائی دے

☆

آنسو کو تیزاب بنا کر
پتھر کو پگھلاتے رہنا

☆

پیڑ سے آندھی سبھی پتے اڑا لے جائے گی
نام جو انکت تنے پر ہے، کہاں لے جائے گی
ناؤ کاغذ کی، گھروندا، شنک، گھونگے سیپیاں
ایک آئے گی لہر سب کچھ بہالے جائے گی
ڈال سے ٹوٹا ہوا پتہ ہوں میری شرط کیا
جاؤں گا ہی اب ہوا مجھ کو جہاں لے جائے گی

☆

رات انگار کی سیج سونا پڑا
یہ نہ سمجھیں کہ یوں ہی غزل ہوگئی

## دشینت کمار:-

دشینت کمار کے ساتھ ہندی غزل کا جدید اور عام بول چال والی زبان کا سفر شروع ہوا۔ اس سے پہلے ہندی میں جو غزل لکھی جا رہی تھی اس میں شیرینی کی کمی تھی۔ دشینت کمار نے سنسکرت اور فارسی کی عصری تلمیحات کو چھوڑ کر سیدھی ہندوستان میں بولی جانے والی زبان کو اپنایا اور غزل کہہ کر مقبول بھی ہوئے۔ دشینت کا یہ شعر ان کی غزل کی تعریف ان کے اپنے اسلوب اور لہجے میں ہے۔

میں جسے اوڑھتا بچھاتا ہوں
وہ غزل آپکو سناتا ہوں

دشینت کے بعد بہت سے ہندی کے شاعروں کا رجحان غزل کی طرف بڑھا۔

دشینت نے اپنی غزل کے ذریعہ ہندی کے شاعروں کو یہ بھی بتادیا کہ غزل کو اس کی ساخت کے ساتھ (یعنی اسی طرح ردیف قافیہ مقطع مطلع) اپنایا جا سکتا ہے۔ ہندی غزل کے لئے کسی بھی قسم کی کوئی تبدیلی کی ضرورت نہیں ہے سوائے اپنے عہد کی ترجمانی کرنے کے۔ ان کا تخیل اور فکر وہی رہا جو اردو غزل میں تھا۔ فارسی ترکیبوں کا استعمال اردو غزل میں بھی بہت کم ہو گیا ہے۔

دشینت کمار ۱۹۳۳ء میں پیدا ہوئے اور اکتالیس سال کی عمر میں ۳۰ر دسمبر ۱۹۷۵ء کو دنیا سے رخصت ہو گئے۔ ان کی غزل کا مجموعہ ''سائے میں دھوپ'' بہت مقبول ہوا۔ ان کے مشہور اشعار پیش ہیں۔

کیسے آکاش میں سوراخ نہیں ہو سکتا
ایک پتھر تو طبیعت سے اچھالو یارو

☆

یہاں تک آتے آتے سوکھ جاتی ہیں کئی ندیاں
مجھے معلوم ہے پانی کہاں ٹھہرا ہوا ہوگا
یہ سارا جسم جھک کر بوجھ سے دہرا ہوا ہوگا
میں سجدے میں نہیں تھا آپ کو دھوکا ہوا ہوگا

ایسے کوی اور شاعروں کے لئے جو دوسروں کی نقل میں شعر تو کہہ لیتے ہیں لیکن ان کی چوری پکڑی جاتی ہے ان لوگوں کو دشینت نے پہچان لیا ہوگا تبھی یہ شعر کہا:

ان کا کہیں جہاں میں ٹھکانا نہیں رہا
ہم کو تو مل گیا ہے ادب میں مقام اور

دشینت کی غزل عصری غزل کا آغاز ہے۔ ان کے یہاں کلام میں گہرائی معنویت اور خوبصورتی ہوتی ہے۔

دشینت کمار نے اپنی غزل کے دائرے کو کسی ایک موضوع تک محدود نہیں رکھا بلکہ کائنات میں بکھرے ہوئے تمام مسائل کو بہت خوبی اور خوش اسلوبی سے پیش کیا ہے۔ عشق ہو یا عام آدمی کی تکلیف یا انتظامیہ اور حکومت پر غصّہ سب کچھ انہوں نے با اندازِ غزل لکھا۔ اسی لئے وہ جدید ہندی غزل کے رہنما کہلائے۔ دشینت کا اپنا انداز ان اشعار میں ملاحظہ ہو۔

پھر مرا ذکر آگیا ہوگا
برف سی وہ پگھل رہی ہوگی

☆

کہاں تو طے تھا چراغاں ہر ایک گھر کے لئے
کہاں چراغ میسّر نہیں شہر کے لئے

☆

کیسی مشعلیں لے کے چلے تیرگی میں آپ
جو روشنی تھی وہ بھی سلامت نہیں رہی

☆

کل نمائش میں ملا وہ چیتھڑے پہنے ہوئے
میں نے پوچھا نام تو بولا کے ہندوستان ہے

دکشت دنکوری نے ''غزل دشینت کے بعد'' کتاب کو ترتیب دیا ہے اور پیش

لفظ آر. پی. شرما، ڈاکٹر رام داس مشرا، ڈاکٹر شیر جنگ گرگ، قمر برتر، ڈاکٹر کنور بے چین، ڈاکٹر امریندر، ڈاکٹر جانکی پرشاد شرما، ڈاکٹر انی رودھ شرما اور طویل تجزیہ دکشت دنکوری نے کیا ہے۔ یہ مضامین اگرچہ بہت اختصار سے لکھے گئے ہیں لیکن چالیس صفحات پر مشتمل ہیں اور ہندی غزل کے طریقہ کار کی اپنے اپنے طور پر اچھی ترجمانی کرتے ہیں۔ اگرچہ کئی جگہ اختلافی صورتیں پیدا ہوتی ہیں لیکن ان میں سے کوئی بھی نقاد غزل کی بنیادی ساخت مثلاً آہنگ ردیف قافیہ سے منحرف نہیں ہوتا۔ مقطع مطلع جیسے تمام ضروری آداب ہندی غزل والوں نے اپنائے ہیں۔

جن ہندی کے جدید ترین کویوں نے اردو غزل کو پوری طرح اپنایا ہے اس سے ہمیں بھی اپنی اردو غزل کی عصری لفظیات میں اضافہ کرنے میں مدد ملتی ہے۔ یہاں پر میں ''غزل دشینت کے بعد'' کے ۲۰۰۵ء کے ایڈیشن (جو ہندی رسم الخط میں ہے) سے مختصر تجزیاتی تعارف مختلف ادیبوں اور کویوں کے پیش کرتی ہوں۔

پہلا تعارف آر. پی. شرما مہارشی کا ہے۔ ان کا خیال ہے:

> ''यह उल्लेखनीय है कि ग़जल अपने कथ्य के साथ-साथ अपने शिल्प के कारण ही लोकप्रियता की ऊंचाईयों तक पहुंची है।''
>
> (पेज-XIII)
>
> (''یہ اُلیکھنیے (قابل ذکر) ہے کہ غزل اپنے کتھئے (بیان) کے ساتھ ساتھ اپنے شلپ (اسلوب) کے کارن (وجہ) ہی لوک پریتا (مقبولیت) کی اونچائیوں تک پہنچی ہے۔'')

(پیج-XIII)

ڈاکٹر رام درشن مشرا نے اپنے مقدمہ میں اس بات کی فکر ظاہر کی ہے کہ ہندی غزل کو ہندی کویتا کی پرم پرا (روایت) کا بھی دھیان رکھنا چاہئے۔ وہ کہتے ہیں۔

''हिन्दी ग़ज़ल के नाम पर लिखी जा रही इधर की ग़ज़लों में भी सुविधानुसार अरबी-फारसी के कठिन अप्रचलित शव्द का प्रयोग मिलता है।''

(पेज-XIV)

(''ہندی غزل کے نام پر لکھی جا رہی ادھر کی غزلوں میں بھی سویدھا انوسار (سہولت کے مطابق) عربی۔ فارسی کے کٹھن (مشکل) اپرچلت (غیر مروج) شبد (الفاظ) کا پریوگ (استعمال) ملتا ہے۔'')

(پیج۔XIV)

ڈاکٹر شیر جنگ گرگ اپنے پیش لفظ میں جس کا عنوان ہے ''غزل کی ہندی دنیا'' لکھتے ہیں:

''आज का हिन्दी कवि खासकर लोकप्रिय होने की हसरत रखने वाला कवि ग़ज़ल लिखने की ओर अकृष्ट हुआ है।''

(पेज-XVII)

(''آج کا ہندی کوی خاص کر لوک پریہ (مقبول) ہونے کی حسرت رکھنے والا کوی غزل لکھنے کی اور اکرشٹ (راغب) ہوا ہے۔'')

(پیج۔XVII)

ڈاکٹر کنور بے چین آج کی ہندی غزل کے بڑے کوی ہیں۔ انہوں نے اپنے مضمون میں لکھا ہے کہ جن لوگوں نے غزل کو ترقی کے راستے پر گامزن کیا ان غزل کاروں میں سردار جعفری، کیفی اعظمی کے نام نمایاں ہیں اور غزل میں منظر کشی کرنے والوں میں فراق گورکھپوری، بشیر بدر وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

ڈاکٹر کنور بے چین لکھتے ہیں:

''हिन्दी के कवि की भाषा संस्कृतनिष्ट शब्दावली की संवाहिका रही किन्तु दुष्यन्त के बाद ग़ज़ल के अन्य अनेक भाषाओं के शब्दों का समावेश करते हुए ग़ज़ल के कोरे फारसीपन तथा कोरे संस्कृत-प्रधानता को त्यागकर उसे हिन्दुस्तानीपन प्रदान किया। ग़ज़ल में अंग्रेजी के कुछ आम शब्दों का प्रयोग भी किया जाने लगा''

(पेज-XXIII)

(''ہندی کے کوی کی بھاشا (زبان) سنسکرت نشٹ (سنکرت سے پُر) شبداولی (لفظیات) کی سنواہیکا (قاصد) رہی کنتو (لیکن) دشینت کے بعد غزل کے انیہ انیک (دوسرے کئی) بھاشاؤں (زبانوں) کے شبدوں کا سماویش (الفاظ کو شامل کرنا) کرتے ہوئے غزل کے کورے فارسی پن تھا کورے سنسکرت پردھانتا (سنسکرت نما) کو تیاگ کر (چھوڑ کر) اسے ہندوستانی پن پردان (دیا) کیا۔ غزل میں انگریزی کے کچھ عام شبدوں (لفظوں) کا پریوگ (استعمال) بھی کیا جانے لگا۔'')

(پیج-XXIII)

ڈاکٹر امریندر جو بھاگل پور (بہار) کے رہنے والے ہیں اپنے مضمون جس کا عنوان ہے ''جو حقیقت بیان کردوں۔ مٹھیاں تان لوگے تم'' اس مضمون میں اسی بات کو لے کر ناراضگی کا اظہار کیا ہے کہ غزل میں ثقیل الفاظ کا استعمال نہیں ہونا چاہئے۔ غزل ایسی زبان میں ہو جو عام آدمی سمجھ سکے۔ لکھتے ہیں:

''मुझे तो करूणा आती है हिन्दी के उन ग़ज़ल कारों पर जो अरबी फारसी के शब्दों को जोड़ने में ग़ज़ल की हत्या करते रहते हैं। हिन्दी भाषा के कई शायरों में यह समझदारी अभी भी नहीं आई है, इसी से इनकी ग़ज़लों की भाषा ''विचित्र भाषा'' है। कहीं ये पंडिताऊ भाषा लिखते हैं तो कहीं बोझिल विदेशी भाषा। यह अभी तक नहीं समझ पाये हैं कि ग़ज़ल की भाषा वह काव्य भाषा है जो दो सम्प्रदायों को जोड़ने वाली है, न वह हिन्दू है, न मुसलमान।''

(ग़ज़ल दुष्यंत के बाद, पेज-XXVI)

(''مجھے تو کروڑاں (رحم) آتی ہے ہندی کے ان غزل کاروں پر جو عربی فارسی کے شبدوں (لفظوں) کو جوڑنے میں غزل کی ہتیا (قتل) کرتے رہتے ہیں۔ ہندی بھاشا (زبان) کے کئی شاعروں میں یہ سمجھداری ابھی بھی نہیں آئی ہے۔ اسی سے ان کی غزلوں کی بھاشا ''وچتر بھاشا'' (عجیب وغریب'' ہے۔ کہیں یہ پنڈتاؤ بھاشا لکھتے ہیں تو کہیں بوجھل ودیشی بھاشا (غیر ملکی زبان)۔ یہ ابھی تک نہیں سمجھ پائے ہیں کہ غزل کی بھاشا وہ کاویہ بھاشا (شعری زبان) ہے جو دو ساmپردایوں (فرقوں) کو جوڑنے

والی ہے نہ وہ ہندو ہے نہ مسلمان۔")

(غزل دشینت کے بعد، پیج۔XXVI)

جدید غزل کے اثرات ہندی غزل میں واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ ہندی میں کئی طالب علم غزل پر پی.ایچ.ڈی. کی ڈگری لے چکے ہیں۔ ان میں سے ایک ڈاکٹر درگیش نندنی ہیں وہ اپنی کتاب۔ جو ۲۰۰۶ء میں شائع ہوئی ہے جس کا نام ہے:

"भारतीय काव्य शास्त्र में हिन्दी ग़ज़ल की संकल्पना"

اس کتاب کو دہلی کے پبلشر "کلاسیکل پبلشنگ کمپنی، ۲۸، شاپنگ کامپلیکس، نئی دہلی۔110015 نے شائع کیا ہے۔

ڈاکٹر نندنی لکھتی ہیں۔

"हिन्दी ग़ज़ल की शुरूआत अमीर खुसरो से मानी जाती है। खुसरो की प्रसिद्ध ग़ज़ल में एक पंक्ति हिन्दी की है, दूसरी फारसी की। विद्वानों ने ग़ज़ल के इस तरह के विधान को अमीर खुसरो की विनोदवृत्ति का परिचायक माना है। गज़ल इस प्रकार है :

"ज़े हाल मिस्कीं मकुन तग़ाफुल दुराए नैना बनाए बतियाँ
के ताबे हिजरां नदारम दि जाँ न लेहु काहे लगाय छतियाँ"
"बहक्क़े रोज़े-विसाल दिलबर कि दाद मारा फरेब 'खुसरो'
सपीत मन की दुराय राखूँ जो जान पाऊँ पिया की गतियाँ"

"ہندی غزل کی شروعات (ابتداء) امیر خسرو سے مانی جاتی ہے۔ خسرو کی پرسدھ (مشہور) غزل میں ایک پنکتی (مصرعہ) ہندی کی ہے دوسری فارسی کی۔ ودوانوں (عالموں) نے غزل

کے اس اس طرح کے ودھان (اصولوں) کو امیر خسرو کی

ونودورتی (مزاحیہ پن) کا پری چارک (تعارف کرانے والا) مانا

ہے۔غزل اس پرکار (طرح) ہے۔

زحال مسکیں مکن تغافل درائے نیناں، بنائے بتیاں

کہ تاب ہجراں نہ دارم جاں نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں

بجق روز وصال دلبر کہ داد مارا فریب خسرو

سپیت من کی درائے رکھوں جو جانے پاؤں پیا کی گھتیاں

امیر خسرو کی غزل کا ایک مصرعہ فارسی تو دوسرا برج اور کھڑی بولی کا سنگم ہے۔اسی لئے ڈاکٹر نندنی دوسرے تنقید نگاروں کی طرح امیر خسرو کو ہندی کا پہلا غزل گو مانتی ہیں۔

ڈاکٹر نندنی کا کہنا ہے کہ ہندی کے عالموں نے ہندی غزل ساہتیہ کی تاریخ کو دو زمانوں میں بانٹ دیا ہے۔ پہلا زمانہ ''دشینت سے پہلے کا ہے اور دوسرا دشینت کے بعد۔

نیرج ہندی غزل کے بڑے شاعر ہیں وہ غزل کے بارے میں کہتے ہیں۔

''ग़ज़ल काव्य की एक श्रेष्ठतम विद्या है। चूँकि ग़ज़ल का सामान्य अर्थ ''बा ज़ना गुफ़्तगू करदन''।

(किताब-डॉ. नन्दिनी)

(''غزل کاویہ (شاعری) کی ایک شریشٹھ تم (اعلیٰ ترین) ودھا (صنف) ہے۔ چونکہ غزل کا سامانیہ (عام) ارتھ (معنی) ''بازنہ گفتگو کردن'')

(کتاب۔ڈاکٹر نندنی)

یہی بات اردو والے شروع سے کہتے آئے ہیں کہ عورت سے گفتگو کرنے

کا نام غزل ہے۔ ترلوچن شاستری غزل کے اصول کی وہی بات ہندی غزل کے لئے کہتے ہیں۔

"ग़ज़ल का हर शेर स्वतंत्र होता है।"

(किताब- डॉ. दुर्गेश नन्दिनी, पेज-12)

("غزل کا ہر شعر سوتنتر (آزاد) ہوتا ہے۔")

(ترلوچن شاستری کتاب ڈاکٹر نندنی صفحہ ۱۲)

غزل کی تعریف صرف محبوب اور عورت سے بات کرنے کی نہیں ہے بلکہ ان تمام موضوعات پر غزل میں شعر کہے گئے ہیں جو عام آدمی کی زندگی کے دکھوں، تکلیفوں اور خوشیوں سے جڑے ہوئے ہیں۔ ہندی غزل لکھنے والے دشینت کمار سے لے کر وجے واطلے تک جب غزل لکھنے میں کامیاب ہوتے ہیں تو ہندی اردو غزل کا فرق تقریباً ختم ہو جاتا ہے اور وہ تمام موضوعات جو سو سال سے غزل میں لکھے جا رہے ہیں ان کو ہندی غزل والے اپنے یہاں آج کی زبان میں لکھ رہے ہیں۔

یہاں تو صرف گونگے اور بہرے لوگ بستے ہیں
خدا جانے یہاں پر کس طرح جلسہ ہوا ہوگا

(دشینت کمار)

اردو غزل کا مزاج ہے کہ اس نے ہر آدمی کا درد، تکلیفیں، آنسو، بوجھ، ارادے، حوصلے یقین سمندر کی گہرائی سب کو اپنے اندر سمولیا اور غزل کے شاعر نے اس کو غزل بنا دیا۔ آج شاعر اور کوی جو غزل لکھ رہا ہے وہ عام آدمی کی بولی میں اور عام آدمی کے مسائل پر لکھ رہا ہے۔ یہاں چند ایسے اشعار پیش کئے جا رہے ہیں جو عام بول چال کی

زبان میں ہیں یعنی اگر ان کو ہندی لپی میں لکھا جائے تو ہندی ہیں اور اگر اردو رسم الخط میں لکھا جائے تو اردو ہیں۔ مثلاً:

**رام پرکاش گوئل:**

مسافر زیست کا فسانہ ہے
جو بھی آیا ہے اس کو جانا ہے

**اُدئے بھانو ہنس:**

صرف جنگل میں ڈھونڈتے کیوں ہو
بھیڑئے اب کدھر نہیں ہوتے

**اخلاق ساگری:**

یہ تو کھلونے والے کی مجبوری ہے ورنہ
کس بچے کا رونا اس کو اچھا لگتا

**جگدیش شریواستو:**

دوستی دیکھ لی - دشمنی دیکھ لی
آئیے زندگی دیکھ لی
ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا ہے آئینہ
دل جو ٹوٹا درد کی مسکان میں

**اشوک گیتے:**

ہواؤں کی خبر رکھنا
بہاروں پر نظر رکھنا

انہیں ملتا رہے امرت
میری خاطر زہر رکھنا

**ماڑنک ورما:**

ان میں طوفان کی کہانی ہے
سیپیوں کو سنبھال کر رکھنا
یہ ہے بستی عجیب لوگوں کی
ہر قدم دیکھ بھال کر رکھنا

**وید دیوانہ :-**

میں اسی موڑ پہ مدت سے کھڑا ہوں کے جہاں
ایک آواز یہ آئی تھی کہ ہم آتے ہیں

**رمیندر جاکھو ساحل :**

کشمکش کب تلک چھپی رہتی
بات حد سے گزر گئی ہوگی
زرد پتوں سے بھر گیا آنگن
کوئی امید مرگئی ہوگی
آج اخبار میں خبر آئی
لاپتہ کل سے زندگی ہوگی

**مدھوریما سنگھ :**

میں نے آہٹ سنکر سوچا بچھڑی خوشیاں آئی ہیں
غم نے مجھکو ڈھونڈ لیا ہو یہ بھی تو ہو سکتا ہے

☆

میری یادوں نے چھو لیا ہوگا
ہنستے ہنستے وہ رو دیا ہوگا
تیری خوشبو سے روح مہکے تو
رنگ غزلوں کا جوگیا ہوگا

## اشوک مزاج:

وہ ہماری کیا حفاظت کر سکیں گے بولئے
ان کو خود اپنی حفاظت کو سپاہی چاہئے

☆

طوفاں میں ہم کو چھوڑ کے جانے کا شکریہ
اب اپنے ہاتھ پاؤں ہی پتوار ہو گئے

## اشوک ساھنی:

نفرت کو بڑھانے کا رجحان رہے گا
ہر اہل وطن یونہی پریشان رہے گا

☆

اس کی آمد سے میرے گھر میں بہار آتی ہے
وہ جو چاہے تو مرے گھر کو بھی ویرانہ بنادے

☆

تم نے سورج کبھی پچھم سے نکلتے دیکھا
اس کو وعدہ نہیں کہتے جو وفا ہو جائے

☆

تیری صورت سے حسیں اور بھی مل جائیں گے
جس میں سیرت بھی تری ہو وہ کہاں سے لاؤں

☆

خواب بن جاؤ تم اگر میرا
میں یہ آنکھیں نہ عمر بھر کھولوں

☆

تیری تصویر تو تھی آنکھوں میں
بہہ کے اشکوں نے مٹا دی ہوگی

# جدید غزل کا مجموعی جائزہ

فارسی غزل کو ذہن و دل سے نہ کسی نے نکالا اور نہ کامیاب غزل گو شعراء نے اس سے کلّی طور پر انحراف کیا۔ اردو غزل وؔلی، میر تقی میرؔ، اسد اللہ خاں غالبؔ، سے لیکر فراق گورکھپوری اور پھر ہمارے عہد کے غزل کے ناصر کاظمی، ابن انشاء، احمد فراز اور اسی دور میں دو چار سال جونئر بشیر بدر اور ندا فاضلی کی غزلوں نے ثابت کر دیا کہ زندگی کے مسائل سب جگہ یکساں ہیں۔ پھر بھی زندگی مسلسل رواں دواں رہتی ہے۔ نہایت شائستگی کے ساتھ پیرہن بدلتی رہتی ہے۔ سب سے بڑی مثال یہ ہے کہ وؔلی سے لے کر مرزا غالبؔ، مومن خاں مومن، حسرت موہانی، جگر مرادآبادی اور غزل کے اہم اور عظیم شاعر فراق گورکھپوری نے کبھی غزل کی پرانی لفظیات اور موضوعات کو نہیں بھلایا۔ اگر چہ فراق گورکھپوری، حسرت موہانی اور دیگر اس عہد کے عظیم شاعروں نے غزل میں نئے نئے رنگ و آہنگ اور نئے نئے خیالات سے غزل کی دنیا بدل دی تھی۔

زبان زندگی کے ساتھ ساتھ چلتی ہے اور وقت و حالات کے ساتھ اس میں تبدیلیاں ہوتی چلی جاتی ہیں اور یہ تبدیلیاں ہر تعلیم یافتہ سمجھدار یا ادب سے تھوڑا سا بھی تعلق رکھنے والے قبول کرتے چلے جاتے ہیں۔ جس طرح اردو غزل میں حسرت موہانی، فراق گورکھوپری نے ہندی کے خالص لفظوں کو غزل کا حسن عطا کر کے جانِ غزل اور جانِ اردو بنا دیا تھا اسی طرح اس کے بعد کی نسل نے تقریباً چالیس پچاس سال کی مشقت

میں اپنے ماضی یعنی وَلی سے حسرتؔ موہانی تک اہم اسلوب کی حفاظت کی۔ پھر دھیرے دھیرے جدید اردو غزل کے شعراء نے غزل میں انگریزی کے سینکڑوں الفاظ شامل کر لئے کیوں کہ وہ بول چال کی زبان میں روانی سے بے جھجک بولے جا رہے تھے۔ مثلاً اسکول ٹرین، آفس کالج وغیرہ انگریزی الفاظ کو اردو نثر و نظم میں جگہ سرسید احمد خاں اور حالیؔ نے دی تھی۔ انگریزوں کے جانے کے بعد ہندوستانیوں میں انگریزی سے نفرت کم ہونے لگی تھی اور بول چال میں جو انگریزی الفاظ رائج تھے وہ غزل میں بھی آنے لگے تھے۔ جس کی ابتداء طنز و مزاح کی شاعری میں اکبرالہٰ آبادی پہلے ہی کر چکے تھے، مثلاً:

قوم کے غم میں ڈنر کھاتے ہیں حکّام کے ساتھ
رنج لیڈر کو بہت ہے مگر آرام کے ساتھ

یا ان کا یہ مصرعہ: ''رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانوں میں''

انگریزی الفاظ کی باقاعدہ اور سنجیدگی سے غزل میں ابتداء ڈاکٹر بشیر بدر نے کی:

وہ زعفرانی پلوور اسی کا حصّہ ہے
کوئی جو دوسرا پہنے تو دوسرا ہی لگے

☆

کوئی پھول دھوپ کی پتیوں میں ہرے ربن سے بندھا ہوا
وہ غزل کا لہجہ نیا نیا نہ کہا ہوا نہ سنا ہوا

اردو زبان میں ابتداء سے ہی انگریزی، ہندی اور دیگر علاقائی زبانوں کے الفاظ کو اپنے اندر شامل کر لینے کی لچک اور قوت موجود تھی۔ اسی لئے اردو غزل نظم اور نثر

میں دوسری زبانوں کے الفاظ بغیر کسی دشواری کے شامل ہوتے چلے گئے۔ یہی حال اردو غزل کے موضوعات کا ہے۔ ذرائع ابلاغ کے فروغ نے دنیا کو سمیٹ کر چھوٹا کر دیا ہے اور عالمی مسائل بھی آسانی سے غزل کے شعراء تک پہنچ رہے ہیں اور وہ انہیں غزل کا موضوع بنا رہے ہیں۔ آج کے ذہین سامع کے لئے ایسی ہی غزل کی ضرورت ہے جس کے اشعار میں آج کے عالمی مسائل ہوں۔ حوصلہ بڑھانے والے اشعار ہوں۔ آسانی سے سمجھ میں آنے والے الفاظ ہوں، تاکہ جدید ذہن رکھنے والے بھی اس سے مستفید ہو سکیں۔

قدیم اردو غزل کی طرح جدید اردو غزل کو بھی اپنی ہیت بدلنے یا اپنی بحروں اور اصولوں سے باہر آنے کی نہ اجازت تھی نہ ضرورت ہے۔ تقریباً تین سو سال سے غزل زندگی سے ہم آہنگ ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ غزل زندگی کا مثبت اظہار ہے۔ غزل کا فن روانی اور شیرینی بھی چاہتا ہے اور اپنی ہیئت کی وجہ سے پہچانا جاتا ہے۔ پروفیسر آل احمد سرور کا کہنا ہے کہ:

> ''غزل اپنے طور پر زندگی کی واردات اور کیفیات پیش کرتی رہے گی۔ اس کی زبان میں خاموش تبدیلی ہوتی رہے گی مگر اس کی ایمائی صلاحیت اور دروں بینی کی خصوصیت باقی رہے گی۔''

(''اردو غزل'' صفحہ ۳۰، اردو اکادمی دہلی)

مثلاً سارے عالم کے لئے پیغام غزل کے اس شعر میں موجود ہے جس کی ضرورت سب محسوس کر رہے ہیں۔

سات صندوقوں میں بھر کر دفن کردو نفرتیں
آج انساں کو محبت کی ضرورت ہے بہت

(بشیر بدر)

وَلی سے لے کر فراق گورکھپوری، جگر مراد آبادی، حسرت موہانی، غزل کو جتنا زندگی کے قریب لے آئے تھے اس کے سہارے آج ہماری غزل اس قابل ہوگئی ہے کہ نئے نئے اور نوجوان شعراء بدلتی ہوئی دنیا، بدلتی ہوئی روایات، بدلتے ہوئے ہندوستان اور بدلتی ہوئی زندگی کو غزل میں پیش کر سکتے ہیں۔ اس لحاظ سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ موجودہ عہد کا بولی جانے والی زبان کا اور بدلتی ہوئی خوبصورت جدید دنیا کا سچّا اظہار غزل میں ہو رہا ہے۔ غزل ان تمام سیکڑوں سال پرانی روایتوں کو اپنے سینے میں بسائے کچھ نئے اضافے کر رہی ہے۔ ان اضافوں کے پیچھے شاعر اور ادیب کے کمال کے ساتھ جدید زندگی کے بدلنے کا معجزہ بھی شامل ہے۔ بہر حال غزل کا یہ کمال بدستور قائم رہا کہ اس نے وَلی سے لے کر جگر مراد آبادی تک کی غزل کے عروض کو مانا، اس کے آہنگ کو اپنے دل و جان کا نغمہ سمجھا اور انھیں روایتوں کے سہارے اور ان کی طاقت سے ہماری جدید اردو غزل نے نئی اور معنی خیز دنیا کو جو عالمی طور پر خوب صورت ہے اپنایا۔ دنیا چاہے کتنی ہی بدل جائے اور جدیدیت کی طرف رُخ کرتی چلی جائے غزل تب بھی اردو ادب کو مایوس نہیں کرے گی اور زندگی کی ترجمانی کرنے کی کوشش کرتی رہے گی۔ ویسے مجموعی طور پر جدید غزل اسے کہیں گے جس کا آغاز ترقی پسند تحریک کے ٹھیک بعد جدید فکری اور شعری رجحانات کے تحت ہوا ہے، جس کی رفتار میں تیزی آزادی کے بعد آئی ۔ ہندوستان اور پاکستان کے شعراء نے ایک ہی قسم کے احساسات اور جذبات کی عکاسی

اپنی غزلوں میں کی کیوں کہ دونوں جگہ کے حالات ایک تھے۔ پریشانیاں اور دشواریاں ایک تھیں، ظلم وستم ایک ہی طرح کے ہو رہے تھے۔ اس کے علاوہ غزل کا روایتی خاکہ دونوں کا مشترک تھا۔ غزل کی ساخت اس کی ہیئت میں کوئی بڑی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ لیکن غزل کے روایتی موضوعات میں بدلاؤ بہت تیزی سے آیا۔ اکثر شعراء نے تغزل کی جگہ سماجی انتشار، خلفشار، ذہنی پراگندگی، معاشی بدحالی، تشدد فساد، بدامنی، بداعتمادی، گندی سیاست، غربت، افلاس، معاشی عدم توازن کو جگہ دی۔ غزل کی اس صلاحیت نے کہ وہ ہر عہد اور ہر تمدن کی نمائندگی کر سکتی ہے اسے ان تمام موضوعات کا ترجمان بنا دیا جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔

ہندوستان اور پاکستان میں جو غزل کی زبان چلی آرہی تھی اس میں یہاں نمایاں تبدیلی یہ آئی کہ عربی فارسی کے صقیل الفاظ کی جگہ ہندی، انگریزی الفاظ نے لے لی۔ جس کے نتیجے میں قدیم شعراء کے یہاں غزل میں ہندی کے الفاظ تو خال خال ہی ملتے ہیں لیکن جدید شعراء کے یہاں ان کی تعداد زیادہ نظر آتی ہے۔

آخر میں مطالعہ کا اختتام اس بات پر کرنا چاہوں گی کہ ہمارے عہد کی غزل جو فارسی سے لے کر اردو کی جدید غزل اور زندگی کا ہم آہنگ نغمہ رہی اور پھر اکیسویں صدی میں جس رفتار سے ریڈیو، ٹی وی گھروں میں داخل ہوئے تو ہمیں یہ خدشہ ضرور تھا کہ اس کے سامنے کتابیں رسالے اور اخبار ماضی کی چیزیں ہو جائیں گے لیکن زندگی کے ساتھ اس کارنامے میں غزل کو بھی شامل کرنا چاہئے کہ ہر لمحہ چاہے وہ کتنا ہی سائنسی شعور سے حیات و کائنات کو دیکھنے لگے غزل چپکے سے انسان کے دل کا نغمہ اور ذہن کا آئینہ بن جاتی ہے۔ یہاں یہ لکھنے میں ذرا بھی تکلف نہیں محسوس کرتی ہوں کہ زمانہ جس رفتار سے

زمین کی گہرائیوں اور آسمان کی بلندیوں پر گیا ہے غزل نے زندگی کے ہر تجربے کو غزلیہ بنالیا ہے اور علامہ اقبال کا یہ عظیم اور قدیم شعر اب پوری طرح سے سمجھ میں آیا:

زمانہ ایک، حیات ایک، کائنات بھی ایک

دلیل کم نظری قصہ قدیم و جدید

(علامہ اقبالؔ)

☆☆☆

# کتابیات

## فہرست

### تنقیدی کتابیں، شعری مجموعے اور رسائل

| نمبر شمار | نام کتاب | مرتب/مصنف | ناشر |
|---|---|---|---|
| ۱ | (مقدمہ) شعر و شاعری | مولانا حالی | الناظر پریس کانپور |
| ۲ | داستان تاریخ اردو (تیسرا ایڈیشن) | حامد حسن قادری | نگار بک ایجنسی لکھنؤ |
| ۳ | تنقید کیا ہے | پروفیسر آل احمد سرور | مکتبہ جامعہ دہلی |
| ۴ | حاشیے | فراق گورکھپوری | سنگم پبلشنگ ہاؤس الہٰ آباد |
| ۵ | جدید غزل | پروفیسر رشید صدیقی | سرسید بک ڈپو علی گڑھ |
| ۶ | غزل سرا | مجنوں گورکھپوری | مکتبہ جامعہ دہلی |
| ۷ | غزل اور متغزلین | ڈاکٹر ابولیث صدیقی | اردو اکیڈمی سندھ |
| ۸ | اردو زبان و ادب | ڈاکٹر مسعود حسن خان | علی گڑھ ایجوکیشن بک ہاؤس علی گڑھ |
| ۹ | اردو غزل | ڈاکٹر یوسف حسن خاں | انجمن ترقی اردو علی گڑھ |

| ۱۰ | حسرت موہانی | عبدالشکور | انوار بک ڈپو لکھنؤ |
|---|---|---|---|
| ۱۱ | تنقید و تجزیہ | ابو محمد سحر | کتابستان۔ الہٰ آباد |
| ۱۲ | نقوش لاہور، | محمد طفیل | ۲۸ جلدیں |
| ۱۳ | گل کدہ | عزیز لکھنوی | صدیقی بک ڈپو لکھنؤ |
| ۱۴ | کلیات حسرت موہانی | حسرت موہانی | مکتبہ اشاعت اردو، دہلی |
| ۱۵ | کلیات فانی | فانی بدایونی | انجمن ترقی اردو علی گڑھ |
| ۱۶ | نشاط روح | اصغر گونڈوی | شیخ مبارک علی لاہور |
| ۱۷ | سریلی بانسوری | آرزو لکھنوی | پرواز بک ڈپو لکھنؤ |
| ۱۸ | شعلہ طور | جگر مرادآبادی | سلطان بک ڈپو حیدرآباد |
| ۱۹ | آتش گل | جگر مرادآبادی | فروز پرنٹنگ ورکس لاہور |
| ۲۰ | کلیات جگر | جگر مرادآبادی | عثمانیہ بک ڈپو، حیدرآباد |
| ۲۱ | کلیات اثر سلمان | اثر لکھنوی | نظامی پریس لکھنؤ |
| ۲۲ | نقش و نگار (نصیب غزلوں کا) | جوش ملیح آبادی | کتب خانہ رشیدیہ دہلی |
| ۲۳ | روح کائنات | فراق گورکھپوری | سنگم پبلشرز الہ آباد |
| ۲۴ | شبستان | فراق گورکھپوری | سنگم پبلشرز الہ آباد |
| ۲۵ | رمز کنایات | فراق گورکھپوری | سنگم پبلشرز الہ آباد |
| ۲۶ | شعبہ ساز | فراق گورکھپوری | سنگم پبلشرز الہ آباد |

| نمبر | کتاب | مصنف | ناشر |
|---|---|---|---|
| ۲۷ | سویرا | | لاہور |
| ۲۸ | خواب گل پریشاں | احمد فراز | حسامی بک ڈپو، حیدر آباد |
| ۲۹ | جاناں جاناں | احمد فراز | نصرت پبلشر، لکھنؤ |
| ۳۰ | درد آشوب | احمد فراز | مکتبہ دین وادب، لکھنؤ |
| ۳۱ | پس انداز موسم | احمد فراز | حسامی بک ڈپو، حیدر آباد |
| ۳۲ | ساز سخن بہانہ ہے | ادا جعفری | غالب پبلشرز، پوسٹ باکس 4079 لاہور |
| ۳۳ | غزل۔دشینت کے | دکشت دنلوری | وانی پرکاشن، دہلی |
| ۳۴ | بعد (ہندی) دو پارٹ | | |
| ۳۵ | غزل (ہندی میں) | وجے واطے | وانی پرکاشن۔دہلی |
| ۳۶ | دومصرعے (ہندی میں) | وجے واطے | میگھا پبلشر دہلی |
| ۳۷ | نئی آواز | ڈاکٹر رفعت سلطان | لاریب کمپیوٹر سینٹر بھوپال |
| ۳۸ | فنون لاہور جدید غزل نمبر | احمد ندیم قاسمی | لاہور سن 1949 |
| | | | |
| ۳۹ | گنج سوختہ | شمس الرحمٰن فاروقی | شب خون کتاب گھر الہ آباد |
| ۴۰ | پانی کی زبان | مظفر حنفی | شب خون کتاب گھر الہٰ باد |
| ۴۱ | لفظوں کا پل | ندا فاضلی | نیو رائٹرس پبلکیشن، بمبئی |

| ۴۲ | خالی مکان | محمد علوی | مکتبہ سوغات، بنگلور |
|---|---|---|---|
| ۴۳ | اسم اعظم | شہریار | انڈین بک ہاؤس، علی گڑھ |
| ۴۴ | جنگل میں دھنک | منیر نیازی | نیا ادارہ، لاہور |
| ۴۵ | کاغذی پیرہن | خلیل الرحمٰن اعظمی | آزاد کتاب گھر دہلی |
| ۴۶ | نیا عہد نامہ | خلیل الرحمٰن اعظمی | انجمن ترقی اردو علی گڑھ |
| ۴۷ | چاند نگر | ابن انشاء | مکتبہ اردو لاہور |
| ۴۸ | برگ نے | ناصر کاظمی | مکتبہ اردو لاہور |
| ۴۹ | محراب غزل | روشن صدیقی | مکتبہ جامعہ دہلی |
| ۵۰ | روزن | قتیل شفائی | فروغ اردو لاہور |
| ۵۱ | ایران میں اجنبی | ن.م. راشد | گوشہ ادب چوک انارکلی لاہور |
| ۵۲ | گل تر | مخدوم | مکتبہ صبا حیدر آباد، دکن |
| ۵۳ | شعلہ گل | احمد ندیم قاسمی | قومی دارالاشاعت، لاہور |
| ۵۴ | غزل | مجروح سلطانپوری | انجمن ترقی اردو، علی گڑھ |
| ۵۵ | اندمال | حمیرا رحمٰن | پتہ -۳، ینگ ایونیو، یانکرز، نیویارک اشاعت ۱۹۸۴ء |
| ۵۶ | جدید اردو غزل ۱۹۴۰ء کے بعد | - | خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ اشاعت۔ ۱۹۹۵ء |
| ۵۷ | لفظوں کا پل | ندا فاضلی | |

| ۵۸ | ہم قدم | ندا فاضلی | رام کرشن پرکاشن، ودیشہ |
|---|---|---|---|
| ۵۹ | شب ریزے | ڈاکٹر اختر کاظمی | مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی، بھوپال ۱۹۸۲ء |
| ۶۰ | سوا نیزے پہ سورج | ڈاکٹر اختر کاظمی | دولت گنج لشکر گوالیار (ایم پی) ۱۹۹۶ء) |
| ۶۱ | روشنی کس جگہ سے کالی ہے | فضل تابش | مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی، بھوپال ۱۹۹۴ء |
| ۶۲ | سورج نما | محمد علی تاج | مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی، بھوپال ۱۹۸۱ء |
| ۶۳ | رحمتوں کی بارش (پروین شاکر) | بشیر بدر (مولف) | وانی پرکاشن۔نئی دہلی |
| ۶۴ | کلچر یکساں (بشیر بدر) (ہندی میں) | بسنت پرتاپ سنگھ (مؤلف ونقاد) | وانی پرکاشن، نئی دہلی |
| ۶۵ | بشیر بدر فن و شخصیت | ڈاکٹر رفعت سلطان ڈاکٹر رضیہ حامد | باب العلم پبلیکیشنز نوئڈا۔ ۱۹۸۸ء |
| ۶۶ | کلیات بشیر بدر | ڈاکٹر بشیر بدر | کتب خانہ خورشیدیہ اردو بازار لاہور |
| ۶۷ | آزادی کے بعد کی غزل کا تنقیدی مطالعہ | ڈاکٹر بشیر بدر | انجمن ترقی اردو، دہلی ۱۹۸۱ء |

| ۶۸ | مظہر امام نئے منظر نامے میں | جمال احمد خاں | نرالی دنیا پبلیکیشنس، دریا گنج، دہلی |
|---|---|---|---|
| ۶۹ | پچھلے موسم کا پھول | مظہر امام | نرالی دنیا پبلیکیشنس، دریا گنج، دہلی |
| ۷۰ | ماہ تمام | پروین شاکر | ایجوکیشنل پبلشنگ، ہاؤس دہلی |
| ۷۱ | خوشبو | پروین شاکر | ایجوکیشنل پبلشنگ، ہاؤس دہلی |
| ۷۲ | صد برگ | پروین شاکر | ایجوکیشنل پبلشنگ، ہاؤس دہلی |
| ۷۳ | انکار | پروین شاکر | ایجوکیشنل پبلشنگ، ہاؤس دہلی |
| ۷۴ | خود کلامی | پروین شاکر | ایجوکیشنل پبلشنگ، ہاؤس دہلی |
| ۷۵ | کف آئینہ | پروین شاکر | ایجوکیشنل پبلشنگ، ہاؤس دہلی |
| ۷۶ | Master Couplets of Urdu Poetry | K.C. Kanda | Sterling Publishers Pvt. Ltd. Phase II, New Delhi-20 |
| ۷۷ | Urdu Ghazals An Anthology From 16th to 20th Cntury. | K.C. Konda | |
| ۷۸ | 1960 کے بعد کی غزل کا اسلوبیاتی مطالعہ | ڈاکٹر سرور ساجد | عنبر پبلی کیشنز، نظر خاں لین، مین، روڈ رانچی Pin-834001 |

| ۷۹ | جنگل میں دھنک | منیر نیازی | نذیر احمد چودھری، نیا ادارہ، سویرا آرٹ پریس، لاہور، بار اوّل۔ ۱۹۶۰ء |
|---|---|---|---|
| ۸۰ | جمناتٹ۔ سہ ماہی | | ہریانہ اردو اکادمی |
| ۸۱ | ادبی مجلّہ۔ جلد (۱۹) شمارہ (۳) جولائی تا ستمبر ۲۰۰۵ء | | |
| ۸۲ | گل صد برگ | عبدالمنان | روشن پریس نمبرا، سری ناتھ بابو لین، کلکتہ۔ ۷۳ اپریل ۱۹۹۱ء |
| ۸۳ | جدید شاعری | پروفیسر ظہیر احمد صدیقی | ایجوکیشنل بک ہاؤس۔ علی گڑھ ۱۹۹۳ء |
| ۸۴ | نایافت | احمد فراز | پبلشر کتابی دنیا، ۱۹۵۵ ترکمان گیٹ، دہلی، اشاعت ۲۰۰۲ء |
| ۸۵ | اردو شاعری پر ایک نظر | کلیم الدین احمد | بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ ۱۹۸۵ء |
| ۸۶ | زندگی اے زندگی (آخری مجموعہ کلام) | خلیل الرحمٰن فاروقی | اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ ۱۹۸۳ء |

| | | | |
|---|---|---|---|
| ۸۷ | انتساب | حمیرا رحمٰن | ناشر۔ ظفر زیدی میموریل، کلچرل سوسائٹی نیویارک، اشاعت ۱۹۹۷ء |
| ۸۸ | وہ تیرا شاعر وہ تیرا ناصر | ڈاکٹر حسن رضوی | سنگ میل پبلی کیشنز لاہور۔ ۱۹۹۶ء |
| ۸۹ | آہنگ | مجاز | آزاد کتاب گھر دہلی |
| ۹۰ | حرف حرف | فیض احمد فیض | کتاب کار پبلیکیشنز رام پور |
| ۹۱ | نقش فریادی | فیض احمد فیض | نیا ادارہ، لاہور |
| ۹۲ | دست صبا | فیض احمد فیض | آزاد کتاب گھر، دہلی |
| ۹۳ | زنداں نامہ | فیض احمد فیض | انجمن اردو |
| ۹۴ | سبیل | پروفیسر آل احمد سرور | سلسلۂ مطبوعات انجمن اردوئے معلیٰ نمبرا |
| ۹۵ | ذوق جنوں | پروفیسر آل احمد سرور | ادارہ فروغ اردو لکھنؤ |
| ۹۶ | سخن مختصر | معین احسن جذبی | انجمن ترقی اردو، علی گڑھ |
| ۹۷ | پتھر کی دیوار | علی سردار جعفری | مکتبہ مشاہراہ، دہلی |
| ۹۸ | اکائی | ڈاکٹر بشیر بدر | کالج اینڈ یونیورسٹی بک اسٹال، بڑا بازار علی گرھ، ۱۹۶۹ء |
| ۹۹ | آمد | ڈاکٹر بشیر بدر | مطبوعہ مکتبہ دین و ادب امین الدولہ پارک لکھنؤ ۱۹۸۵ء |

| ۱۰۰ | امیج | ڈاکٹر بشیر بدر | حسامی بک ڈپو مچھلی کمان حیدر آباد (اے پی) ۱۹۹۳ء |
|---|---|---|---|
| ۱۰۱ | آس | ڈاکٹر بشیر بدر | حسامی بک ڈپو مچھلی کمان حیدر آباد (اے پی) ۱۹۹۳ء |
| ۱۰۲ | آمد (کراچی) | ڈاکٹر بشیر بدر | مکتبہ عمران ڈائجسٹ ۳۷ اردو بازار کراچی ۱۹۹۲ء |
| ۱۰۳ | آسمان (کراچی) | ڈاکٹر بشیر بدر | مکتبہ عمران ڈائجسٹ ۳۷ اردو بازار کراچی ۱۹۹۴ء |
| ۱۰۴ | امیج (کراچی) | ڈاکٹر بشیر بدر | مکتبہ عمران ڈائجسٹ ۳۷ اردو بازار کراچی ۱۹۹۲ء |
| ۱۰۵ | اللہ حافظ | ڈاکٹر بشیر بدر | ماورہ بہاول پور روڈ لاہور، ۲۰۰۱ء |
| ۱۰۶ | آہٹ | ڈاکٹر بشیر بدر | مکتبہ عمران ڈائجسٹ ۳۷ اردو بازار کراچی ۱۹۹۴ء |
| ۱۰۷ | کوئی شام گھر بھی رہا کرو (دوسرا ایڈیشن) | ڈاکٹر بشیر بدر | عظیم علیم پرنٹرز لاہور ۱۹۹۸ء |
| ۱۰۸ | کلیات بشیر بدر (تیسرا ایڈیشن) | ڈاکٹر بشیر بدر | ناصر پبلیکیشنز اردو بازار کراچی ۱۹۹۶ء |

| | | | |
|---|---|---|---|
| ۱۰۹ | کلیات بشیر بدر سلیکٹیڈ غزل (پنجابی میں) | ڈاکٹر بشیر بدر | کتب خانہ خورشیدیہ اردو بازار لاہور |
| ۱۱۰ | اردو سخنور شیرینی (گجراتی میں) | بشیر بدر (اردو غزل گجراتی رسم الخط میں) ایڈیٹڈ ندا فاضلی کیلاش پنڈت | آر.آر. شیتھ و کمپنی بمبئی۔ احمد آباد ۱۹۹۴ء |
| ۱۱۱ | غزل یونیورس | بشیر بدر | ۱۱۔ ریحانی کالونی عیدگاہ ہلس، بھوپال ۲۰۰۳ء |
| ۱۱۲ | آتھینٹک ڈریم | بشیر بدر | طیب ہاؤس ریحانہ کالونی عید گاہ ہلس بھوپال |
| ۱۱۳ | بشیر بدر۔ غزلیں شعر اور جیونی (ہندی) | کنھیا لال نندن | راج پال اینڈ سنز، کشمیری گیٹ دہلی ۲۰۰۴ء |
| ۱۱۴ | اجالے اپنی یادوں کے | ڈاکٹر بشیر بدر | ایڈیٹر : ونیت پاٹھک، شوما پرکاشن، جبلپور (ایم.پی.) ۱۹۹۰ء |
| ۱۱۵ | روشنی کے گھروندے (بشیر بدر کی غزلیں | سریش کمار | ڈائمنڈ پاکٹ بک لمیٹیڈ نئی دہلی ۲۰۰۸ء |
| ۱۱۶ | بشیر بدر نئی غزل کا ایک نام | ندا فاضلی | وانی پرکاشن نئی دہلی۔ ۱۹۹۷ء |

| ۱۱۷ | 1960 کے بعد کی غزل کا اسلوبیاتی مطالعہ | ڈاکٹر سرور ساجد | عنبر پبلی کیشنز، نظر خاں لین، مین روڈ رانچی پن کوڈ۔ 834001 |
|---|---|---|---|
| ۱۱۸ | جنگل میں دھنک | منیر نیازی | نذیر احمد چودھری نیا ادارہ، سویرا آرٹ پریس لاہور |
| ۱۱۹ | جمنا تٹ۔ سہ ماہی جلد ۱۹، شمارہ ۳، جولائی تا ستمبر ۲۰۰۵ء | | ہریانہ اردو اکادمی، ہریانہ |
| ۱۲۰ | گلِ صد برگ | عبدالمنان | روشن پریس، ۱، سری ناتھ بابو لین کلکتہ۔۷۳، ۱۹۹۱ء |
| ۱۲۱ | آزادی کے بعد اردو شاعری مقالات اور مباحث | شہزاد انجم | ساہتیہ اکادمی۔ دہلی ۲۰۰۲ء |
| ۱۲۲ | جدید شاعری | پروفیسر ظہیر احمد صدیقی | ایجوکیشن بک ہاؤس علی گڑھ۔ ۱۹۹۳ء |
| ۱۲۳ | میں ساز ڈھونڈتی رہی | ادا جعفری بدایونی | مرتب ۱۹۴۷ء |
| ۱۲۴ | شہر درد | ادا جعفری بدایونی | تقسیم ہند کی وجہ سے ۱۹۵۰ء یا ۱۹۴۹ء میں شائع ہوا) |
| ۱۲۵ | غزالاں تم تو واقف ہو | ادا جعفری بدایونی | |
| ۱۲۶ | سازِ سخن بہانہ ہے | ادا جعفری بدایونی | جامعہ دہلی |

| ۱۲۷ | گلکاری وحشت کا شاعر مجروح | خلیق انجم | انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی اشاعت ۲۰۰۰ء |
|---|---|---|---|
| ۱۲۸ | نایافت | احمد فراز | پبلشر کتابی دنیا ۱۹۵۵ء ترکمان گیٹ، دہلی اشاعت۔ ۲۰۰۲ء |
| ۱۲۹ | اردو شاعری پر ایک نظر | کلیم الدین احمد | بک امپوریم، سبزی باغ پٹنہ ۱۹۸۵ء |
| ۱۳۰ | اردو غزل میں پیکر تراشی (آزادی کے بعد) | ڈاکٹر شہیر رسول | شعبہ اردو جامعہ ملیہ جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۹۹۹ء |
| ۱۳۱ | بینا شہر میں آئینہ | احمد فراز | حسامی بک ڈپو حیدر آباد ۱۹۸۳ء |
| ۱۳۲ | زندگی اے زندگی (آخری مجموعہ کلام) | خلیل الرحمٰن اعظمی | اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ ۱۹۸۳ء |
| ۱۳۴ | اندمال | حمیرا رحمٰن | ۳۔ ینگ ایونیو، یانکرز، نیویارک ۱۹۸۴ء |
| ۱۳۵ | جدید اردو غزل ۱۹۴۰ء کے بعد | ڈاکٹر حسن رضوی | خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ ۱۹۹۵ء |
| ۱۳۶ | لفظوں کا پل | ندا فاضلی | نیوز رائٹر، پبلیکیشن بمبئی |
| ۱۳۷ | مورناچ | | نیوز رائٹر، پبلیکیشن بمبئی |
| ۱۳۸ | آنکھو اور خواب کے درمیان | ندا فاضلی | نیوز رائٹر، پبلیکیشن بمبئی |

| ۱۳۹ | کھویا ہوا سا کچھ | ندا فاضلی | نیوز رائٹر، پبلیکیشن بمبئی |
|---|---|---|---|
| ۱۴۰ | ہم قدم | ندا فاضلی | رام کرشن پرکاشن، ودیشہ |
| ۱۴۱ | دھوپ کے پھول | ظفر صہبائی | مکتبہ بزم سخن، آلوک پریس تلیا۔ بھوپال ۱۹۷۷ء |
| ۱۴۲ | لفظوں کے پرندے | ظفر صہبائی | فاس کمپیوٹر انکس چوکی تلیا، بھوپال ۱۹۹۸ء |

## سوانحی خاکہ

| | |
|---|---|
| نام : | ڈاکٹر راحت بدر |
| پیدائش : | ۴ر نومبر ۱۹۵۵ء |
| بمقام : | بھوپال (ایم. پی.) |
| شوہر : | ڈاکٹر بشیر بدر |
| والد : | جناب سید فتح علی صاحب مرحوم |
| والدہ : | محترمہ سیدہ بیگم صاحبہ |
| تعلیم : | بی. ایس. سی.، بی. ایڈ.، ڈی. ایچ. بی. ایم. اے.، پی. ایچ. ڈی. (اردو) (عنوان: جدید اردو غزل ۱۹۷۱ء سے ۲۰۰۵ء تک) |
| غیر ملکی سفر : | امریکہ، دبئی، شارجہ، سعودی عرب، پاکستان |
| فرائض : | لیکچرر آل سینٹ انسٹی ٹیوٹ، عیدگاہ ہلس، بھوپال |
| مستقل قیام : | ''طیب ہاؤس'' ۱۱، ریحانہ کالونی، عیدگاہ ہلس، بھوپال (ایم. پی.) ۴۶۲۰۰۱ |
| موبائل نمبر : | 9425302133, 9425007018 |
| لینڈ لائن : | 0755-2547018 |